مجلس ادارت

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری سنہ ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سیمنار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سیمنار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سیمنار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر سنہ ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۴ روپے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سیمنار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۲ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۴۵ ویں جلد

ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۰ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۹۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات	نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱	مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مبارک پور۔ اعظم گڈھ	۵	۶	جناب عطا خورشید صاحب ریسرچ فیلو خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ۔	۲۹۶
۲	مولانا برہان الدین سنبھلی۔ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۲۸	۷	جناب عبدالملک جامعی۔ مدینہ منورہ	۳۸۶
۳	ضیاء الدین اصلاحی	۲، ۴۷، ۸۲، ۸۵، ۱۵۶، ۱۶۲، ۱۸۴، ۲۳۲، ۲۴۲، ۳۱۴، ۳۲۲، ۳۹۳، ۴۰۲، ۴۷۳	۸	پروفیسر عبدالسبحان۔ کلکتہ	۴۶۴
			۹	حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی۔ رفیق دارالمصنفین	۲۲۵، ۲۸۰، ۲۳۶، ۲۷۰، ۳۰۵، ۳۱۰
۴	جناب عارف نوشاہی جامعہ تہران۔ ایران	۱۶۵	۱۰	مولانا غلام محمد صاحب کراچی	۱۴۹
۵	ڈاکٹر عبدالرب عرفان (کامٹی)، صدر شعبۂ اردو فارسی انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ناگپور۔	۴۳۰	۱۱	جناب محمد بدیع الزماں صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلواری شریف پٹنہ	۲۶۳

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات	نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱۲	پروفیسر محمد راشد ندوی صدر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۲۵،۲۴۵	۱۹	جناب شیخ نذیر حسین مدیر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور	۲۲۱، ۳۸۲، ۴۵۳
۱۳	ڈاکٹر محمد زبیر قریشی گجرات یونیورسٹی	۱۳۴	۲۰	جناب نسرین ممتاز بصیر صاحبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۶۲
۱۴	ڈاکٹر محمد طارق حسن ریڈر۔ شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۸۲	۲۱	ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی	۳۴۵
۱۵	مولوی محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین	۵۸	۲۲	ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط دروہا	۱۱۵
				شعراء	
۱۶	ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری استاد شعبہ عربی گورنمنٹ کالج کشمیر	۴۶	۱	پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں	۱۵۴
			۲	جناب رئیس نعمانی علی گڑھ	۳۹۲
۱۷	جناب مختار ٹونکی ٹونک راجستھان	۲۰۴	۳	جناب عروج زیدی مرحوم رامپور	۳۱۴
			۴	جناب وارث ریاضی مغربی چمپارن۔ بہار	۴۷۲
۱۸	پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ	۳۹۰،۴۰۵			

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۵

ماہ جنوری ۱۹۹۰ء تا ماہ جون ۱۹۹۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
	شذرات	۲،۸۲،۱۶۲، ۲۴۲،۳۲۲، ۴۰۲	۸	حالات غدر کا ایک چشم دید گواہ جارج پیش شور اور اس کی نثری تصنیف وقائع حیرت افزا	۳۶۲
	مقالات				
۱	اردو کی حمدیہ شاعری میں فلسفیانہ رجحان	۱۱۵	۹	حضرت میر سید احمد بادپا	۵
۲	اردو میں نعت گوئی	۲۰۴	۱۰	خواجہ حافظ کی شاعری میں تصوف	۳۴۵
۳	اقبال کا فلسفۂ خودی	۲۶۳	۱۱	دینی تعلیم کے نصاب اور عربی مدارس کے سلسلہ میں بعض قابل غور باتیں	۱۸۷
۴	امام قفال کبیر شاشی	۲۷۰			
۵	اورنگ زیب کی ہجو سے مدح تک۔ نعمت خاں عالی کا ذہنی و فکری سفر	۴۳۳	۱۲	ڈاکٹر محمد حسین ہیکل	۲۲۱
۶	تاریخ التراث العربی فواد محمد سیزگین کا اہم کارنامہ	۴۵۳	۱۳	رامائن کے اردو ترجمے	۲۹۶
۷	ثلاثۂ غسالہ	۱۶۵	۱۴	شفیع المعانی ہندوستان میں لکھی جانے والی ایک نایاب فارسی فرہنگ	۲۸۲

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
۱۵	صفات الٰہی کا قرآنی تصور اور مولانا ابوالکلام آزاد	۸۵		**آثار علمیہ وادبیہ**	
۱۶	عبدالغفور نساخ بابائے اردوئے بنگال	۴۶۴	۱	ایک گراں قدر مکتوب سلیمانی	۱۴۹
۱۷	قرآن وسنت کا باہمی ربط	۲۸		اخبار علمیہ	۳۰۵،۲۲۵
۱۸	کیا دیوان قطب الدین دیوان خواجہ بختیار کاکی ہے؟	۴۰۵		**وفیات**	
۱۹	گیارہویں صدی کے ایک کشمیری عالم حضرت موسیٰ بن جعفر	۱۳۴	۱	آہ! مولوی حافظ محمد منصور نعمانی ندوی مرحوم	۲۳۲
۲۰	ماضی اور حال کی عربی نثر نگاری کا ایک تنقیدی جائزہ	۳۲۵،۲۴۵	۲	مولانا مفتی حافظ محمد رضا انصاری فرنگی محلی	۲۲۸
۲۱	مفتی صدرالدین خاں آزردہ دہلوی اور انکا رسالہ الدر المنضود فی حکم امرأۃ المفقود	۴۶	۳	ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم	۳۱۰
	معارف کی ڈاک			**ادبیات**	
۱	مکتوب علی گڈھ	۳۹۰	۱	حمد سے منقبت تک	۱۵۴
۲	مکتوب لاہور	۳۸۲	۲	روزہ	۳۱۴
۳	مکتوب مدینہ منورہ	۳۸۶	۳	غزل	۴۷۲،۳۹۲
				باب التقریظ والانتقاد	
			۱	عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت	۵۸
				مطبوعات جدیدہ	۱۵۶،۷۴، ۳۱۶،۲۳۴، ۴۷۳،۳۹۳

جلد ۱۴۵ ماہ جمادی الآخرہ سنہ ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۰ء عدد ۱

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۲ - ۴

مقالات

حضرت میر سید احمد بادپا — مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مبارکپور اعظم گڈھ — ۵ - ۲۷

قرآن وسنت کا باہمی ربط — مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ — ۲۸ - ۴۵

مفتی صدرالدین خان آزردہ دہلوی اور ان کا رسالہ الدر المنضود فی حکم امرأۃ المفقود — ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری استاذ شعبہ عربی گورنمنٹ ڈگری کالج کشمیر — ۴۶ - ۵۷

باب التقریظ والانتقاد

عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت — محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین — ۵۸ - ۷۳

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۷۴ - ۸۰

ایک ضروری اطلاع

کاغذ، کتابت وطباعت کی گرانی کی وجہ سے جنوری سنہ ۱۹۹۰ء سے معارف کا سالانہ چندہ چالیس روپیے کردیا گیا ہے۔

بیرونی ممالک کے لیے سالانہ چندہ (ہوائی ڈاک سے) دس پونڈ یا بارہ ڈالر، اور (معمولی ڈاک سے) تین پونڈ یا پانچ ڈالر ہوگا۔

معارف کے پاکستانی خریدار اپنا سالانہ چندہ سو روپیے اس پتہ پر ارسال کریں:
حافظ محمد یحییٰ بہ پہلی منزل شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس. ایم. کالج اسٹریچن روڈ کراچی. پاکستان

"منیجر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہندوستان کی نئی حکومت کو پچھلی حکومت سے جو مسائل ورثے میں ملے ہیں ان میں بعض اتنے نازک، پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہیں کہ ان کو جلدی اور آسانی سے حل کرنا ممکن نہیں، تاہم وزیر اعظم مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کا حل تلاش کرنے میں واقعی مخلص اور سنجیدہ ہیں، انھوں نے اپنے پہلے نشریے میں ان اولین اہمیت کے حامل مسائل کا تذکرہ خاص طور سے کیا تھا، اور ان پر پوری توجہ دینے کے لیے اپنے مکمل عزم و ارادہ کا اظہار بھی کیا تھا، مگر پنجاب کے سوا ابھی تک کوئی اور مسئلہ ان کی حکومت کا مرکز توجہ نہیں بن سکا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اب بھی نہ وہاں تشدد اور دہشت گردی میں کمی آئی ہے اور نہ خون خرابہ بند ہوا ہے

نئی حکومت کو ترکہ میں فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ بھی ملا ہے، حال میں وزیر اعظم نے بھاگل پور کا دورہ کیا ہے، جہاں ع ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو۔ اور حکومت کی مشینری اور انتظامیہ نے ایسی قیامت ڈھائی ہے کہ ع آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں۔ دراصل ہر جگہ کے فساد میں امن و امان کے ذمہ دار ہی قتل و غارت گری میں ملوث رہتے ہیں، بہار کے ریاستی وزیر محنت محمد حسین آزاد نے کہا ہے "بہار میں جس جگہ بھی فساد ہوئے وہاں بہار پولیس کا رول بہت ہی گھناؤنا اور خراب رہا، بھاگل پور کا فساد بہت ہی منصوبہ بند طریقے سے اور سازش کے تحت کرایا گیا ہے، اس میں کچھ کانگریسی لیڈر بھی شامل ہیں، بہار کی افسر شاہی خصوصی طور پر بھاگلپور انتظامیہ ایماندار اور غیر جانبدار ہوتا تو فساد پر پوری طرح قابو پا لیا جاتا، مرکزی ریلوے وزیر جارج فرنانڈیز نے کہا ہے کہ بھاگلپور کا حالیہ فساد اس دور کا بدترین فساد تھا، اور ہندوستان کے سیاسی اور سماجی ڈھانچہ پر ایک دھبہ ہے، قابل افسوس بات یہ نہیں ہے کہ اس فساد کے دوران ضلع انتظامیہ

لڑکھڑا گئی تھی اور ایڈمنسٹریشن نام کی کوئی چیز باقی نہیں تھی، بلکہ سب سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ انتظامیہ فرقہ وارانہ بنیاد پر فسادات سے نپٹنے کی کوشش کر رہی تھی"۔

وزیر اعظم نے خود اپنی آنکھوں سے تباہی و بربادی کے مناظر دیکھے ہیں، ان پر کوئی بات مخفی نہ ہوگی، انھوں نے از راہ ہمدردی ریلیف کے لیے ایک کروڑ روپیہ دینے کا اعلان کیا ہے، بہار کی نئی کانگریسی حکومت کے اقدامات کی بھی ستائش کی جا رہی ہے، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ فساد کا سلسلہ کب بند ہوگا، کیا مسلمانوں کے سروں سے یوں ہی جوئے خون گذرتی اور برق خانہ زاد کی شعلہ افگنی برابر جاری رہے گی، وزیر اعظم نے اپنے پہلے نشریے میں ذرائع ابلاغ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آزادی و خود مختاری کا جو اعلان کیا تھا اس کا عام خیر مقدم ہوا ہے، لیکن مسلمانوں کو آزادی سے متمتع ہونے اور امن و عافیت سے رہنے کا موقع کب نصیب ہوگا، شخصی حکومتوں میں بھی اس ظلم و استبداد کی مثال کم ملے گی جو آزاد ہندوستان کی جمہوری اور سیکولر حکومت کے زمانے میں مسلمانوں پر ہوا ہے، ان کے اور مسائل کا کیا ذکر جبکہ ان کا وجود خطرے میں ہے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ ہے

کانگریس کے دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کی پوری ضمانت موجود ہے، لیکن ایک عرصہ سے وہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو گاندھیائی اصولوں کو خیرباد کہہ کر صرف اقلیتوں کا استحصال کرتے رہے ہیں، زبانی ہمدردی کے سوا ان کو مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کو سمجھنے اور ان سے دلچسپی لینے کا کبھی خیال بھی نہیں ہوا، نئی حکومت کو پچھلی حکومت کی غلطیوں سے سبق لینا چاہیے اور مسلمانوں کے معاملہ میں عدل و انصاف اور جمہوریت و سیکولرزم کے تقاضوں کو پورا کرنا اور یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ع صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک۔ یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کا یہ بیان نظر سے گذرا کہ "اگر کسی ضلع میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور فسادات پر قابو پانے میں انتظامیہ نے ذرا بھی غفلت کی تو ضلع افسروں کو براہ راست ذمہ دار گردانا جائے گا" یہ بیان بڑا خوش آیند ہے، بشرطیکہ واقعی اس پر عمل ہو، پچھلی حکومت بھی اس طرح کے بیانات

دے کر خاموش ہو جاتی تھی، گذشتہ بیالیس (۴۲) برسوں سے مسلمان اتنے فریب کھاتے رہے ہیں کہ انھیں اب موجِ آب پر بھی سراب کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔

---

۱۸ ر دسمبر ۸۹ء کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا ایک جلسہ صدر مجلس میر نواب کرامت علی خان مفخم جاہ بہادر کی صدارت میں ہوا، عین اسی زمانے میں زرروشن مخالف تحریک اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اکثر بیرونی ارکان جلسہ میں تشریف نہیں لا سکے، ۵ ر دسمبر کو مجلس عاملہ کے صدر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا، جو بڑی نیک بخت اور عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، قدرۃً مولانا پر اس حادثہ کا شدید اثر ہے، اس لیے وہ اور مولانا محمد رابع ندوی صاحب بھی تشریف نہیں لا سکے، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور حضرت مولانا کے غم و اندوہ کو زائل کرے آمین۔

علوم و فنون کی سرپرستی و قدردانی حیدرآباد کی آصف جاہی حکومت کا خاص امتیاز رہا ہے، شروع ہی سے دارالمصنفین کو ریاست کی سرپرستی میسر آئی، اسی لیے مشہور قومی رہنما ڈاکٹر سید محمود سابق صدر مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کی وفات کے بعد مسند صدارت کے لیے ارکان دارالمصنفین کی نظر انتخاب اسی نامی گرامی خاندان پر پڑی اور نواب مفخم جاہ بہادر کا انتخاب بحیثیت صدر ہوا، عرصہ سے خواہش تھی کہ وہ دارالمصنفین تشریف لا کر اس کے کاموں کا مشاہدہ فرمائیں اور ان کے مفید اور صائب مشوروں سے مستفید ہونے کا موقع ملے، الحمد للہ یہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور نواب صاحب زحمت سفر برداشت کر کے اس ویرانے میں چاندنی چھٹکانے کے لیے ۸ ر دسمبر کو تشریف لائے، انھوں نے دارالمصنفین کے تمام شعبوں کو دیکھ کر مسرت و اطمینان کا اظہار فرمایا، اور مفید مشوروں سے نوازا جس کے لیے ارکان دارالمصنفین ان کے شکر گذار ہیں، ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس میں ضلع حکام اور معززین شہر نے شرکت کی، اس موقع پر ارکانِ دارالمصنفین کی جانب سے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا، اس مختصر قیام میں نواب صاحب اپنی سادگی، اخلاص، علم دوستی اور بڑائی کا نقش اعظم گڈھ والوں کے دلوں پر بٹھا گئے۔ جس کا چرچا یہاں برابر ہو رہا ہے ؎ اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل ۔ می گویمت دعا و ثنا می فرستمت

مقالات

حضرت میر سید احمد بادپا رح

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، مبارکپور اعظم گڈھ

شاہ بدیع الدین مدار مکن پوری رح متوفی ۸۴۴ھ ہندوستان میں نویں صدی کے مشاہیر اور معمّر اولیاء و مشائخ میں سے ہیں، اور ان کی ذات سے اس ملک میں سلسلہ مداریہ کا رواج ہوا، ان کے بارہ معتمدین خاص اور مشاہیر خلفاء میں ایک بزرگ حضرت میر سید احمد بادپا رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جو ضلع اعظم گڈھ کے انتہائی مشرقی شمالی پرگنہ نتھوپور (سیاہ، گھوسی) کے ایک مقام کو لہوا بن میں فروکش ہوئے اور عبادت و ریاضت میں زندگی بسر کر کے اپنے روحانی فیوض و برکات سے اس علاقہ کو فیضیاب کیا اور یہیں انتقال کے بعد دفن کئے گئے۔

مداری سلسلہ کے عام مشائخ کے حالات کی طرح میر سید احمد بادپا کے حالات بھی کمیاب ہیں، تلاشِ بسیار کے بعد صرف دو کتابوں میں ان کے کچھ حالات مل سکے ہیں، ایک شیخ عبد الرحمٰن چشتی رح کی مرآۃ المداری جس میں شاہ مدار کے واقعات کے ضمن میں چار مقامات پر ان کا نام آیا ہے جس سے ان کے علوئے مرتبت اور شاہ مدار سے ان کے خصوصی تعلق کا پتہ چلتا ہے، مرآۃ المداری میں ان کے بارے میں جو کچھ درج ہے حقیقت پسندانہ ہے، اور دوسری کتاب شیخ وجیہ الدین اشرف رح کی بحر ذخار ہے جس میں عام مداری روایات کی طرح میر سید احمد بادپا رح کے بارے میں عقل و نقل کے خلاف باتیں درج ہیں، نیز فصولِ مسعودیہ میں شاہ مدار کے ذکر میں میر سید احمد بادپا رح کا نام آیا ہے جس کا ماخذ مرآۃ المداری ہے، اور اعظم گڈھ گزیٹیر میں ان کی درگاہ کے بارے میں کچھ باتیں چند سطروں میں ملتی ہیں، بہرحال انہی کتابوں

اور بعض دوسری کتابوں کی مدد سے ان کے متعلق جو کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کو درج کیا جاتا ہے۔

شاہ بدیع الدین مدارؒ میر سید احمد بادپاؒ کے حالات سے پہلے ان کے شیخ و مرشد شاہ مدار کے مختصر حالات کا جاننا ضروری ہے، جن سے میر سید احمد بادپاؒ کے حالات سمجھنے میں مدد ملے گی، شاہ مدار کی شخصیت بڑی متنازع فیہ ہے، حتی کہ طبقہ صوفیہ و مشائخ بھی ان کے اور ان کے مریدین و متوسلین اور خلفاء کے حالات سے مطمئن نہیں ہیں، شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے۔

شاہ بدیع الدین مدار غریب احوال و عجائب اطوار از وے نقل می کنند۔

شاہ بدیع الدین مدار سے لوگ عجیب و غریب احوال و اطوار نقل کرتے ہیں۔

اس کے بعد ان کے بارے میں اسی قبیل کی چند باتیں نقل کر کے لکھا ہے:

وبعضے چیزہائے دیگر گویند کہ اصلے ندارد، واز دائرہ شریعت و طریقت خارج ست، واللہ اعلم[1]

اور طبقہ مداریہ کے بعض لوگ دوسری باتیں بیان کرتے ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور وہ شریعت و طریقت کے دائرہ سے خارج ہیں۔

شیخ عبد الصمد بن افضل اکبر آبادیؒ نے ان کے ذکر کے آخر میں لکھا ہے:

وآنچہ دیگر احوال از مریدان و خلفائے او بگوش می رسد ہرگز قسطاس دانش و میزان خرد نسنجد، ناگزیر بہمیں مجمل مفصل سرشتہ سخن کوتاہ گردانید[2]

ان کے دوسرے حالات جو ان کے مریدوں اور خلفاء سے سنے گئے ہیں، وہ عقل و دانش کی میزان پر پورے نہیں اترتے ہیں، مجبوراً مجمل طور پر ان کا حال درج کیا گیا ہے۔

۱؎ اخبار الاخیار ذکر شاہ بدیع الدین مدار ص ۱۷۱ ۲؎ اخبار الاصفیاء قلمی ورق ۵۵۔

نیز شیخ فخر الدین بن شیخ داؤد صدیقی مداری کے ذکر میں اپنے دادا شیخ یوسف بن شیخ عبد اللہ دانشمند کا قول یہ نقل کیا ہے۔

چنانچہ احوال شاہ بدیع الدین مدار در کتب سلف مسطور نیست واز بزرگان متاخرین نیز بگوش نرسید، اگر شیخ فخر الدین را نمی دیدیم مارا بہ بزرگی و ولایت شاہ دلیل نبود[1]

چونکہ شاہ بدیع الدین مدار کے حالات سلف کی کتابوں میں نہیں لکھے گئے، اور بعد کے بزرگوں سے بھی نہیں سنے گئے، اس لئے اگر شیخ فخر الدین کو ہم نہیں دیکھتے تو ہمارے لئے شاہ مدار کی بزرگی اور ولایت کی دلیل نہ ہوتی۔

مداری روایت کے مطابق شاہ مدار کھانا نہیں کھاتے تھے، ان کے بدن اور کپڑے پر مکھی اور میل کچیل نہیں بیٹھتی تھی، ان کے چہرے پر نور برستا تھا، لوگ ان کو سجدہ کرتے تھے، بعد میں ان کے مریدین و خلفاء نے عقل و نقل اور شریعت و طریقت کے خلاف عجیب عجیب حرکتیں کیں، کھانا سدِّ رمق کے لئے کھاتے تھے، بقدر ستر عورت کپڑا پہنتے تھے، اور تجرید و تفرید کے ساتھ اخفائے حال کا اہتمام کرتے تھے، ان باتوں کی وجہ سے علماء اور مشائخ نے ان کی طرف بہت کم توجہ کی، وہ لوگ خود بھی اپنے حال میں مگن رہا کرتے تھے، شاہ مدار اس اعتبار سے مظلوم ہیں کہ ان کے متوسلین نے بعد میں ان کی طرف بہت سی بے بنیاد باتیں منسوب کیں، سید اشرف سمنانیؒ نے لکھا ہے کہ میں ایک مرتبہ حرمین شریفین کے سفر میں ان کے ساتھ تھا، وہ اویسی سلسلہ کے بزرگ تھے، اور ان کو کیمیاء، ریمیاء، سیمیاء اور ہیمیاء کا علم تھا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی ان کے معتقدین میں تھے، شاہ مدار کے حلقہ کی روایت کے مطابق وہ ملک شام کے شہر

۱؎ اخبار الاصفیاء قلمی ورق ۱۰۔

حلب میں باختلاف روایت سنہ ۲۳۰ھ یا سنہ ۲۵۰ھ یا ۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے، اور چھ سو یا چار سو سال تک زندہ رہے، ان کے نسب میں اختلاف ہے، انہوں نے تصوف کی تعلیم و تلقین شیخ طیفور شامیؒ سے حاصل کی اور چودہ سال کی عمر میں حرمین شریفین جاکر حج و زیارت سے مشرف ہوئے، اور وہاں سے ہندوستان آئے، کچھ دنوں کے بعد واپس چلے گئے، دوسری بار براہ سمندر ہندوستان کا سفر کیا، جہاز ٹوٹ گیا، اور وہ ایک جزیرہ میں پہونچ گئے جہاں ملائکہ کے سردار نے ان کو چند لقمے کھلاکر بشارت دی کہ وہ کبھی بھوکے نہیں ہوں گے اور ایک خلعت عطا کرکے کہا کہ ان کے کپڑے اور بدن پر کھی اور میل نہیں بیٹھے گی، وہاں سے ہندوستان آئے، اور کچھ دنوں کے بعد حرمین شریفین جاکر حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، پھر کاظمین اور نجف ہوتے ہوئے بغداد پہونچے وہاں حضرت شیخ عبدالقادر (متوفی سنہ ۵۶۱ھ) سے ملاقات کی، اور ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ جیلانی کی بہن سیدہ نصیبہؒ کو اولاد عطا کی، اور وہاں سے تیسری بار ہندوستان آکر اجمیر گئے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (متوفی سنہ ۶۳۳ھ) کی زیارت کی، اس کے بعد مدینہ منورہ جاکر عبادت میں مشغول ہوگئے، کچھ عرصہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے چوتھی بار ہندوستان آئے۔

اور کالپی ہوتے ہوئے جونپور وارد ہوئے۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ان کا استقبال کیا، کچھ دنوں کے بعد کنتور اور سورت کی راہ سے حجاز چلے گئے اور حج و زیارت کے بعد پانچویں مرتبہ ہندوستان آکر مکن پور میں مستقل قیام کیا اور یہیں کے ہو رہے۔

میر سید احمد بادپاؒ میر سید احمد بادپا کے حسب و نسب، ولایت و مولد اور نشو و نما کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی ہے، بحر ذخار میں مداری عجائبات کی قسم کی ایک روایت ملتی ہے، جس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں، شاہ مدار جب ایک سفر میں بغداد پہونچے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میر سید احمد بادپا کو شاہ مدار کے حوالہ کرکے ان کی تعلیم و تلقین کے متعلق تاکید کی۔

و سید احمد را غوث الاعظم دست گرفتہ بشاہ مدار سپردہ کہ کشاکش ایں مرد بہ تلقین تو مقرر شدہ، از تربیت او غافل نشوی۔

حضرت غوث الاعظم نے سید احمد کا ہاتھ پکڑ کر شاہ مدار کے حوالہ کیا اور کہا کہ اس مرد کی تعلیم و تربیت تمہارے ذریعہ مقرر ہے، تم اس کی تربیت سے غافل نہ ہونا۔

اور اسی وقت میر سید احمد بادپا شاہ مدار کے ساتھ بغداد سے نکلے، شاہ مدار کا یہ سفر براہ سمرقند ہندوستان کی طرف تھا، انہوں نے اس سفر میں کھانا بالکل ترک کردیا تھا، اتفاق سے دو ہفتہ تک کھانے پینے کی کوئی چیز میسر نہیں ہوئی جس کی وجہ سے میر سید احمد بادپا بھوک سے بیتاب ہوگئے، شاہ مدار کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے میر سید احمد بادپا سے کہا کہ تم جانب جنوب چند قدم جاؤ، وہاں ایک خوش نما پانی کا چشمہ ملے گا، اس کے کنارے ہرا بھرا درخت ہوگا، جس کے سایہ میں ایک مرد حقیر اپنے سات دوستوں کا کھانا رکھ کر ان کا انتظار کرتا ہوگا، وہ کھانا تمہارے نصیب کا ہے، جب وہ مرد تم کو کھانا دے تو بسم اللہ پڑھ کر کھا لینا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرکے اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لینا، اور اس مرد سے کہنا کہ تم نے مجھے سات آدمیوں کا کھانا کھلایا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تم کو سات اقلیم یا سات پشت کی بادشاہت دے گا۔

چنانچہ میر سید احمد بادپاؒ اس جگہ گئے، اور اس مرد حقیر نے دیکھا کہ یہ مرد صالح بھوکا ہے تو سوچا کہ میں اور میرے دوست دو ایک دن صبر کرسکتے ہیں یہ نیک آدمی بھوکا معلوم ہوتا ہے، یہ سوچ کر پورا کھانا میر سید احمد بادپا کے سامنے رکھ دیا اور انہوں نے اپنے مرشد کے حکم کے مطابق کھا کر اس مرد حقیر کے حق میں ان ہی لفظوں میں دعا کی، وہ مرد حقیر امیر تیمور گورگان تھا[1]۔

---

[1] بحر ذخار قلمی ج ۲ ص ۳۰۳

اس روایت کی رو سے میر سید احمد بادپا بغداد یا اسی دیار کے رہنے والے تھے، اور اس وقت ان کی عمر اتنی تھی کہ غوث الاعظم کی زبان میں "این مرد" ہو گئے تھے، ان کے بچپن کا دور گذر چکا تھا اور اوران کی روحانی تعلیم و تربیت کا وقت آگیا تھا حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رح اپنے وطن گیلان سے ۴۸۸ھ میں بغداد تشریف لائے اور یہیں ۵۶۱ھ میں فوت ہوئے، اسی مدت میں یہ واقعہ ہوا ہوگا۔

اور مرآۃ المداری میں ہے کہ جب شاہ مدار اجمیر سے کالپی پہونچے تو میر سید احمد بادپا ان کے ساتھ تھے، اس وقت وہ "در عالم سیر و طیر بے نظیر بود" کے مرتبہ کو پہونچے تھے اور گجرات یا ہندوستان کے کسی علاقہ کے رہنے والے تھے، مرآۃ المداری میں ان کا نام پہلی بار اسی موقع پر یوں آیا ہے۔

وچند مرید صاحب کمال وکار دید مثل شاہ مدار، سید جلال الدین المشہور سید جمن، وسید احمد بادپائے در عالم سیر و طیر بے نظیر بود وغیرہ عزیزان صاحب مشرب ہمراہ داشت اکہ از ولایت گجرات و از نواحی ہر دیار بخدمتش پیوستہ بودند[1]

شاہ مدار کے ساتھ کالپی میں ان کے چند مریدان صاحب نظر سید جلال الدین عرف سید جمن اور سید احمد بادپا جو دنیائے سیر و پرواز میں بے نظیر تھے ان کے علاوہ دوسرے عزیزان ہم مشرب ان کے ساتھ تھے جو کہ ولایت گجرات اور ہر طرف سے ان کی خدمت میں آئے تھے۔

مرآۃ المداری میں میر سید احمد بادپا کا نام دوسری بار اس وقت ملتا ہے جب وہ مکن پور میں سکونت پذیر ہو گئے اور اس دیار کے بعض اہل علم ان کے پاس امتحان اور بحث و مباحثہ کے خیال سے پہونچے جس سے ان کے علمی مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔

[1] مرآۃ المداری قلمی ورق ۲۹

دراں ایام قاضی شہاب الدین مظہر کہ جامع العلوم وقت بود، باصد طالب علم بطریق امتحان بخدمت آنحضرت رسید، وحضرت شاہ مدار پیش از آمدن اوبمریدان صاحب کمال مثل حضرت شاہ الدولہ ؟ وسید جلال الدین المشہور سید جمن، وسید احمد بادپائے، وقاضی شہاب الدین قدوائی.... مستغرق بودند، وحال بغایت قوی داشتند، ایشاں را منع فرمود کہ قاضی مظہر بجہت امتحان و مباحثہ می آید، ہیچ یکے از شما مزاحم مقال او نشود، من بطرزے او را براہ خواہم آورد۔[1]

مکن پور کے ایام قیام میں قاضی شہاب الدین مظہر جو اپنے وقت کے جامع العلوم تھے ایک سو طالب علموں کے ساتھ امتحان کے ارادے سے شاہ مدار کی خدمت میں آئے، شاہ مدار نے ان کی آمد سے پہلے ہی اپنے باکمال مریدوں جیسے شاہ الدولہ؟ سید جلال الدین عرف سید جلال الدین عرف سید جمن سید احمد بادپا، قاضی شہاب الدین قدوائی جو کہ بحر حرفت میں غرق تھے اور انتہائی روحانیت رکھتے تھے، ان کو منع کیا کہ قاضی مظہر امتحان اور بحث کے لئے آرہے ہیں، تم لوگوں میں سے کوئی ان کی بات میں دخل نہ دے میں ان کو اپنے طور پر راہ راست پر لاؤنگا۔

اور جب بحث و مباحثہ میں قاضی مظہر اور ان کے تمام شاگرد مدار کے قائل ہو کر ان کی بیعت و ارادت میں آگئے۔ تو ان سب کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے شاہ مدار نے اپنے باکمال اور قوی حال مریدوں میں سے سید جلال الدین عرف سید جمن اور میر سید احمد بادپا رح کو منتخب کر کے کچھ دنوں کے لئے ان کے حوالہ کر دیا، اسی سلسلہ میں میر سید احمد بادپا رح کا نام تیسری بار آیا ہے۔

[1] مرآۃ المداری قلمی ورق ۶۰۔

دو قاضی مظہر باشاگردان سرزمین نیاز آوردہ توبہ کرد، و بشرف ارادت مشرف گردید، پس سید جلال الدین و سید احمد بادپائے را فرمان شد کہ قاضی را باشاگرداں چند روز صحبت خود نگاہ دارید کہ صلاح ایں طائفہ را بفہمند، بعد ازاں من او را بشغل باطن خود... خواہم ساخت الغرض قاضی مظہر را بطرز صوفیہ اہل صفا مشغول ساختہ بمرتبۂ بلند و تکمیل رسانید کہ او خود صاحب ارشاد گشت و عالمی را ہدایت بخشید۔[1]

قاضی مظہر اپنے شاگردوں کے ساتھ شاہ مدار کے قائل ہو کر ان کی بیعت و ارادت سے مشرف ہو گئے تو سید جلال الدین اور سید احمد بادپا کو حکم ہوا کہ تم دونوں قاضی مظہر اور ان کے شاگردوں کو چند روز اپنے پاس رکھو تاکہ وہ لوگ اس گروہِ صوفیہ کے طور طریقہ کو سمجھیں، اس کے بعد میں اپنے شغل باطن سے ان کو راہ راست پر لاؤں گا... چنانچہ شاہ مدار نے ان کو یوں مرتبہ کمال تک پہنچایا کہ خود صاحب ارشاد ہو کر ایک عالم کو راہِ ہدایت دکھائی۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید جلال الدین اور میر سید احمد بادپا دونوں حضرات شاہ مدار کے خاص علمی و روحانی معتمد تھے، جن سے وہ اپنے اہل علم مریدوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی خدمت لیتے تھے، مرآۃ المداری میں تین مقامات پر سید جلال الدین اور میر سید احمد کا نام آیا ہے دو مقام پر صرف ان ہی دونوں حضرات کا نام ہے، اور ایک مقام پر دوسرے خلفاء کے نام کے ساتھ ہے اس سے بھی میر سید احمد بادپا کی علمیت و جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے، نیز شاہ مدار کے

[1] مرآۃ المداری ورق ۶۲

خلفاء میں وہ روحانی سیر و پرواز میں اپنی مثال نہیں رکھتے ہیں، ان کی اس خاص صفت کو مرآۃ المداری میں دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ (ورق ۲۸ اور ورق ۸۲)

فضائے روحانیت اور عالم باطن میں ان کے سیر و طیر کی وجہ سے ان کا لقب بادپا مشہور ہو گیا اور بحر ذخار میں ملا محمد صالح ہرگانوی کے حوالے سے جو یہ درج ہے کہ:

لقب وے بائیں پاؤ ازاں ست کہ چند سال برپائے چپ استادہ عبادت کردہ است۔[1]

ان کا لقب بائیں پاؤ ہے کیوں کہ انہوں نے چند سال تک بائیں پیر پر کھڑے ہو کر عبادت کی تھی۔

صحیح نہیں ہے، ہمارا خیال ہے کہ بادپا عوامی تلفظ میں بائیں پاؤ ہو گیا ہے، دونوں میں صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے اور عوام میں یہی مشہور ہو گیا تو اس کے لئے وجہ بنالی گئی۔

نیز بحر ذخار میں مرآۃ المداری کے حوالے سے لکھا ہے کہ "او سہ صد و چند چلہا جا بجا کشیدہ" یعنی میر سید احمد بادپا نے تین سو سے زائد چلے جا بجا کھینچے ہیں، ہمارے سامنے مرآۃ المداری کا جو مخطوطہ ہے اس میں یہ عبارت نظر نہیں پڑی ہے میر سید احمد بادپا کے علوئے مرتبت کا اندازہ ان القاب سے بھی ہوتا ہے جن سے شیخ وجیہ الدین اشرف نے بحر ذخار میں ان کا تذکرہ شروع کیا ہے۔

"آں نزہت آرائے چارچمن توحید، آں طراوت پیرائے گلشن تجرید، آں تاج بخش سلاطین و فقراء، آں مشغول ہوائے دوست، سید احمد بادپا، مرید و خلیفہ رشید شاہ بدیع الدین قطب المدار ست۔"

وفات اور مزار میر سید احمد بادپا کی ولادت کی طرح ان کی تاریخ وفات بھی معلوم نہیں ہے، نیز ان کی عمر کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے، شاہ مدار کے ستر خلفاء میں سے اکثر کی وفات نویں صدی

[1] بحر ذخار ج ۲ ص ۳۰۳

کے آخر یا دسویں صدی کی ابتدا میں ہوئی ہے، میر سید احمد بادپا کی وفات بھی ان ہی حدود میں ہوئی ہوگی۔ بحر ذخار کی روایت کے مطابق وہ چھٹی صدی کے نصف اول میں بغداد میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے یہاں ابھی خاصی عمر کے تھے، اگر نویں صدی میں ان کی وفات مانی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی عمر کم وبیش تین سو ۳۰۰ سال کی تھی جو میزان عقل و دانش پر پوری نہیں اترتی ہے، شاہ مدار کالپی میں ۸۳۰ھ کے حدود میں گئے تھے، جہاں مداری روایت کے مطابق ان کے غیظ و غضب کی آگ میں اسی سال شیخ سراج سوختہ جل کر فوت ہوئے تھے اس وقت میر سید احمد بادپا شاہ مدار کے ہمراہ تھے نیز سید جلال الدین عرف سید جمن موجود تھے اس کے بعد مکن پورہ کے زمانہ قیام میں بھی یہ دونوں حضرات شاہ مدار کی خدمت میں برابر رہے اس سے علم و روحانیت اور مشیخت و فضیلت میں دونوں حضرات کے ہم پلہ ہونے کے ساتھ ان کے ہم عصر اور ہم عمر ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے، چھوٹے بڑے کا فرق رہا ہوگا۔

مرآۃ المرادی میں شاہ مدار کے اجلّہ خلفاء کے مقامات ولایت و مزارات کا ذکر نہایت تحقیق و تفصیل سے کیا گیا ہے، مگر ان میں سے کسی کی تاریخ وفات نہیں ہے، شیخ محمود کنتوری اور ان کے صاحبزادے بیٹھا مداری کے مزارات کنتور میں بیان کر کے لکھا ہے۔

وحضرت قاضی مظہر نیز بغایت عظیم القدر بود، و در شہر کالپی آرامگاہ اوست، وحضرت قاضی شہاب الدین قدوائی در موضع جلالی؟ خفتہ تصرف در آں دیار می کند، وحضرت شاہ الدولہ؟ در ولایت گور بنگالہ آسودہ است، شہرتے عظیم دارد، وحضرت میر سید جلال الدین المشہور سید جمن کہ در قصبہ سلیہ؟ قریب بنارس مسکن گرفتہ تصرفے قوی دارد، وحضرت سید احمد بادپائے در سیر وطیر نظیر نہ داشت در جنگل کلھوابن نواحی شہر جونپور آرامگاہ اوست، وحضرت شاہ اجودھن مداری کہ شہر اودھ مسکن گرفتہ است، وحضرت شیخ بڈھن صدیقی کہ در قصبہ سندیلہ قرارگاہ اوست، وشاہ بھکاری کہ در شہر قنوج شہرت دارد، وحضرت شمس الدین لاٹ؟ کہ در شہر لکھنؤ مسکن گرفتہ بود تا امروز مرقد او زیارت گاہ خلق است، وغیرہ۔[1]

حضرت قاضی مظہر نہایت جلیل القدر تھے ان کی آرامگاہ شہر کالپی میں ہے، قاضی شہاب الدین قدوائی کا مرقد موضع جلالی میں ہے، شاہ الدولہ؟ بنگال کے شہر گور میں آسودہ خواب ہیں، میر سید جلال الدین عرف سید جمن نے قصبہ سلیہ؟ قریب بنارس میں اپنا مسکن بنایا، سید احمد بادپا جو کہ سیر و طیر میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے کلھوابن کے جنگل میں ان کی آرامگاہ ہے جو کہ شہر جون پور کے اطراف میں ہے، شاہ اجودھن مداری نے اودھ کو اپنا مسکن بنایا، شیخ بڈھن صدیقی کی قرارگاہ سندیلہ میں ہے۔ شاہ بھکاری شہر قنوج میں مشہور ہیں، شیخ شمس الدین نے شہر لکھنؤ کو مسکن بنایا اور ان کا مرقد آج تک زیارت گاہ خلق ہے۔

شیخ عبدالرحمن چشتیؒ متوفی ۱۰۹۴ھ کے اس صاف و صریح بیان کے بعد کہ میر سید احمد بادپاؒ کی آرامگاہ نواحی جونپور میں کلھوابن کے جنگل میں ہے، ان کی جائے دفن میں کوئی شبہ نہیں ہے، چنانچہ فصول مسعودیہ میں بھی مرآۃ المداری کے حوالے سے بعینہ یہی عبارت نقل کی ہے، اور ان کے مزار کے بارے میں کوئی شک وشبہ ظاہر نہیں کیا ہے[2] مگر شیخ وجیہ الدین اشرف نے بحر ذخار میں جس کا

---

[1] مرآۃ المداری ورق ۸۲، [2] فصول مسعودیہ ص ۲۲۲

سنہ تصنیف ۱۳۰۱ھ ہے، میر سید احمد بادپا کا مزار کہلوا بن میں بتانے کے ساتھ اس میں شک کا اظہار کیا ہے۔

مزار شریفش در کوہوابن است ...	ان کا مزار کلھوابن میں ہے مگر تحقیق یہ
اما تحقیق آں ست کہ از مزار شریفش	ہے کہ ان کے مزار کے بارے میں کوئی
در احاطہ تحریر نمی گنجد۔	بات احاطہ تحریر میں نہیں آئی۔

جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا شاہ مدار نے انتقال سے کچھ دن پہلے اپنے خلفاء کو تنہا تنہا بلا کر سب کا مقام ولایت مقرر کر دیا تھا، جہاں ان کے بعد وہ حضرات جاکر عبادت و ریاضت اور رشد و ہدایت میں زندگی بسر کر کے فوت ہوئے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر سید احمد بادپا اپنے مرشد کی ہدایت پر یہاں آئے اور دیگر خلفاء کی طرح وہ بھی اس جگہ فوت ہو کر مدفون ہوئے۔

مرآۃ المداری کی تصریح کے مطابق گیارہویں صدی تک ان کی قبر کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا مگر بحر ذخار کے بیان کے مطابق بارہویں صدی میں شبہ پڑ گیا، اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء میں ہے کہ کہلوابن درگاہ پرگنہ نتھوپور میں ہے، سید احمد بادپا جن کو عموماً میرا صاحب کہتے ہیں، انھوں نے چالیس دن تک بغیر کھائے پئے چلّہ کیا تھا، ان ہی کے نام پر میلہ (عرس) چھ ہفتہ لگاتار ہر جمعرات کو لگتا ہے۔ جیٹھ کے آخری ہفتہ سے شروع ہوتا ہے، کہلوابن کے قریب چنڈیل راجپوتوں کی آبادی گھاگھرا کے کنارے ہے[1]، اور یہاں کے عوام و خواص اس جگہ کو میر سید احمد بادپا کا چلّہ بتاتے ہیں، میں نے حال ہی میں اس مقام کو جاکر دیکھا ہے دریائے گھاگھرا کے جنوب سیلی اور نشیبی علاقہ میں ایک بلند قطعہ زمین پر احاطہ کے اندر اور باہر کئی قبریں ہیں اور احاطہ کے اندر پورب جانب پختہ چہار دیواری ہے، اس کے کھلے صحن میں ایک بڑا سا اونچا قبر نما چبوترہ ہے، اس پر چادر پڑی ہوئی ہے،

۱؎ اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۶۵۔

اور اس کے جنوبی مشرقی گوشہ میں لوہے کی بھاری بھرکم، روایتی زنجیر لٹک رہی ہے جس میں مقامی روایت کے مطابق میر سید احمد بادپا نے راجہ کہلوا کو جکڑ دیا تھا، میری تحقیق میں یہی بلند چبوترہ ان کا مزار ہے، اور یہ صحیح نہیں ہے کہ یہاں پر میر سید احمد بادپا نے چلّہ کیا ہے، چلّہ کی جگہ چبوترہ کے مانند نہیں ہوتی ہے بلکہ زاویہ وخلوہ اور چھوٹی سی کوٹھری ہوتی ہے، ہندوستان کی خانقاہوں میں چلّہ کی جگہ اسی قسم کی ہوتی ہے، لاہور میں حضرت سید علی ہجویریؒ اور تھانہ بھون میں حاجی امداد اللہؒ کی چلّہ گاہ ہم نے دیکھی ہے جو تنگ و تاریک زاویہ کی شکل میں ہے۔

شیخ وجیہ الدین اشرف کے اس بیان سے بھی اس کی تاکید ہوتی ہے کہ اسی جگہ میر سید احمد بادپا کا مزار ہے۔

"در ایام عرس خلائق آں دیار نذر می آرند، و طریق سوختن آسیب در ایام عرس زیادہ می باشد ... اگر کسے در کوہوابن راہ گم می کند بطریق مسافر پابر ومنع کدام جانور نمودار شدہ براہ راست می گزارند"[1]

ان باتوں کی صحت و عدم صحت سے قطع نظر مصنف بحر ذخار کے بیان کے مطابق ایام عرس میں نذر و نیاز لائی جاتی ہے، آسیب جلایا جاتا ہے، بھولے بھٹکے آدمی کو میر سید احمد بادپا نکل کر راستہ دکھاتے ہیں، یہ سب باتیں وہاں پر ان کی قبر کے وجود پر دلیل ہیں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرور زمانہ اور کتبہ و قبہ وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس حظیرہ کی قبروں میں ان کی قبر مشتبہ ہو گئی، اور پتہ نہ چل سکا کہ ان میں ان کی قبر کون ہے؟

میر سید احمد بادپا کہلوابن اپنے مرشد شاہ مدار کے امر و حکم کے مطابق ان کے انتقال کے بعد گئے، اور باقی زندگی وہیں بسر کی، شاہ مدار کا انتقال ۱۸ جمادی الاولی ۸۴۴ھ میں سلطان

۱؎ بحر ذخار ج ۲ ص ۳۰۳

ابراہیم شاہ شرقی کے آخری دور سلطنت میں مکن پور میں ہوا، اس سے کچھ ہی پہلے انہوں نے اپنے ستر خلفاء کو تنہا تنہا بلا کر وصیت و نصیحت کی اور ہر ایک کے لئے اس کے مقام ولایت کی تعیین کر کے رشد و ہدایت کی خدمت سپرد کی، مرآۃ المداری میں ہے۔

پس حضرت شاہ مدار در ایام آخر حیاتِ
خود ہر روز بعضے ازاں مریدان صاحب
تکمیل جدا جدا بنوبت در جائے خلوتِ
خود می طلبید و ہر یک را بوصیتے و نعمتے
مخصوص و مفتخر می گردانید و مقامے
بجہت سکونت او متعین می ساخت و
اجازتِ ارشاد مع خرقۂ خلافت عطا
می فرمود۔[1]

شاہ مدار نے اپنی زندگی کے آخری
دنوں میں اپنے کامل خلفاء میں سے ہر
ایک کو روزانہ باری باری سے خلوت
میں بلا کر وصیت و نعمت سے نوازا،
خرقۂ خلافت عطا کیا اور ہر ایک خلیفہ
کی جائے سکونت مقرر و متعین کر کے
ارشاد و تلقین کی اجازت دی۔

فصول مسعودیہ میں بھی مرآۃ المداری کے حوالہ سے یہ بیان درج ہے، بلکہ مناقب الاولیاء کے حوالہ سے میر سید احمد بادپا قدس سرہ کے نام کی تصریح ہے۔[2]

اس بیان کے مطابق میر سید احمد بادپا نے شاہ مدار کے انتقال سنہ ۸۴۴ھ کے بعد کہلوابن میں سکونت اختیار کی، اور ارشاد و ہدایت اور خدمت خلق میں باقی زندگی یہیں بسر کر کے وفات پائی، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کا مزار کہلوابن ہی میں ہے، جس طرح شاہ مدار کے دیگر خلفاء اپنے اپنے مقام ولایت میں فوت ہوئے اور ان کے مزارات وہیں بنے۔

پرگنہ نتھو پور کا علاقہ شرقیوں، لودھیوں اور مغلوں کے دور سلطنت میں جونپور میں شمار ہوتا

---

[1] مرآۃ المداری ورق ۸۲، [2] فصول مسعودیہ ص ۲۲۱ و ص ۲۲۲۔

تھا، دریائے گھاگھرا اور دریائے گنگا کا دوآبہ ہونے کی وجہ سے قدیم زمانہ میں چھوٹی بڑی جھیلوں اور گھنے جنگلوں پر مشتمل تھا، تال نرجا اور تال رتوئے آج وہاں کے مشہور تال ہیں، یہ دریائے گھاگھرا کا دوارہ اور گانجر ہے جس کا سلسلہ دیوریا تک چلا گیا ہے، اس علاقہ میں طاقتور راجپوتوں کی آبادی تھی، جن میں کئی راجے اور بڑے زمیندار تھے، وہ یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک تھے بلکہ اس دیار میں ان ہی کی حکومت تھی، اعظم گڈھ گزیٹیر میں یہاں چندیل راجپوتوں کی آبادی کا ذکر ہے اور ایک انگریز مسٹر ٹی، ڈبلیو، ٹالبورٹ اسسٹنٹ کمشنر ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں نے یہاں کے بارے میں لکھا ہے کہ درمیان گنگا و گھاگھرا کے راجپوت بکثرت آباد ہیں، اس طرف بینسوارہ یعنی ملک گوت بتینس واقع ہے، بلکہ اس کے تمام گرد و نواح میں نشان ظاہر ہے کہ ایام سابقہ میں ملکیت علی راجپوتوں کی تھی، اعظم گڈھ اور غازی پور اور مئو کے دوآبہ میں یہی آباد ہیں،[1]

نتھو پور کے مشرق میں دو میل پر مدھوبن واقع ہے جو راجہ مادھو مل کے نام پر آباد ہے، اس کے شمال میں تین چار میل پر کوہوابن ہے، یہ غالباً راجہ کولہوا کے نام پر آباد ہے، جو قدیم زمانہ میں گھاگھرا سے تھوڑے فاصلہ پر جنوب میں گھنا جنگل (بن) تھا، مرآۃ المداری کی عبارت "در جنگل کہلوابن" سے معلوم ہوتا ہے کہ میر سید احمد بادپا کے زمانہ میں یہ علاقہ جنگلات پر مشتمل تھا، آج بھی یہاں کے نشیب و فراز اور جھاڑ جھنکاڑ دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ سارا علاقہ جنگل اور بن رہا ہوگا، چونکہ یہ مرکزی مقامات سے دور اور دشوار گذار تھا اس لئے یہاں کے باشندے آزاد اور بیرونی طاقتوں سے نبرد آزما رہا کرتے تھے۔

اسی علاقہ میں سنہ ۸۴۴ھ کے بعد میر سید احمد بادپا تشریف لائے اور مستقل سکونت اختیار کی، یہاں ان کے دوران قیام میں ایک عظیم سانحہ ہوا جس میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور شر و فساد

---

[1] خلاصۂ حال اقوام ہند ص ۵۱، ص ۵۲ مطبوعہ ۱۸۷۰ء،

کا بازار گرم ہوا، اس کی تفصیل شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں (جو شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی کے حالات میں ہے) بیان کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دور سلطنت میں ولایتِ بالا سے ایک بزرگ شیخ عبدالحکیم صدیقیؒ جون پور آئے، ان کے ساتھ ان کے اور خاندان کے اٹھارہ[۱۸] نوجوان لڑکے بھی تھے، سلطان ابراہیم شاہ نے ان کو اپنے مقربین میں شامل کرلیا، اور کچھ دنوں کے بعد ان کو پرگنہ نتھوپور اور دیگر پرگنہ جات کی مدارالمہامی پر مامور کیا، شیخ عبدالحکیم صدیقی نے اپنے اعوان وانصار کے ساتھ یہاں آکر سرکشوں کو زیر کیا، اور بگڑے ہوئے حالات درست کرکے نتھوپور سے مجھولی اور بہار تک سلطان ابراہیم شاہ کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا، اور کئی سال تک نہایت کامیاب حکومت کی، مگر آخری شرقی بادشاہ حسین شاہ (۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ) کی بہلول لودھی بادشاہ دہلی سے جنگ اور سلطان حسین شاہ کی شکست کے دوران یہاں کے حالات میں ابتری پیدا ہوگئی، اور اطراف وجوانب کے راجوں اور زمینداروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جم غفیر جمع کرکے شیخ عبدالحکیم صدیقی پر اجتماعی حملہ کردیا، اور جس طرح مسعود سالار پر راجوں نے اجتماعی حملہ کرکے ان کو شہید کردیا اسی طرح یہاں کے راجوں نے شیخ عبدالحکیم صدیقی اور ان کے لڑکوں کو شہید کردیا۔[۱]

۸۷۸ھ میں سلطان بہلول لودھی اور سلطان حسین شرقی کے درمیان جنگ ہوئی جس میں سلطان حسین شرقی شکست کھاکر بنگالہ کے بادشاہ علاءالدین شاہ کی پناہ میں چلا گیا، اور سلطان بہلول لودھی نے اپنے لڑکے باربک کو جونپور کا حاکم بنایا، بعد میں سلطان حسین نے اس کو سلطان سکندر لودھی کے خلاف ابھار کر اس کی مدد کی مگر باربک شکست کھاکر جونپور چلا آیا، اسی انتشار وخلفشار اور باہمی جنگ وجدال کے نتیجہ میں اس نواح میں بغاوت اور سرکشی کا ظہور ہوا، اور

[۱] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی، دارالمصنفین،

مسلمان کو ایک عظیم حادثہ سے دوچار ہونا پڑا، ساتھ ہی جونپور سے شرقی سلطنت بھی ختم ہوگئی، بعد میں لودھیوں نے اس علاقہ میں معقول انتظام کیا، سلطان ابراہیم لودھی کے نام پر ابراہیم پور (سپاہ) آباد ہوا، اس کے آگے سلطان سکندر لودھی کے نام پر سکندر پور (بلیا) آباد ہوا۔ اس علاقہ کی ایک بستی لدھوائی بھی لودھیوں کا پتہ دیتی ہے، کچھ مدت تک یہ دیار شیر شاہ سوری کے زیرِ تصرف رہا اور مقامی روایت کے مطابق وہ میر سید احمد بادپا کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوا اور خانقاہ کے خدام اور واردین وصادرین کے لئے جاگیر عطا کی، اور اس کے خاندان کی ایک خاتون "بانو بی بی" کے "چک بانو بی بی" اب تک چلا آرہا ہے۔[۱]

نتھوپور اور اس کے نواح کا مذکورہ بالا حادثہ یہاں پر میر سید احمد بادپا کے دوران قیام

[۱] مغل دور میں راجہ عظمت خاں بانی عظمت گڈھ کے بیٹے مہابت خاں نے مدھوبن سے اتر دلیا تک اپنی حکومت قائم کرلی تھی، بعد میں نواب اودھ سے جنگ کرکے گورکھپور میں قید ہوئے (مقدمہ حیات شبلی) یہاں نوابی اودھ کے دور میں میر سید احمد بادپا کے آستانہ کی جاگیر کے سلسلہ میں ۱۲۱۱ھ میں نواب آصف الدولہ کی طرف سے ایک سند ملی تھی، ۱۸ اپریل ۱۸۱۳ء میں مبارکپور میں زبردست جنگ ہوئی جس میں کلکھوابن کے قریب سورج پور کا بابو جبر دھاری سنگھ ہاتھی پر سوار ہوکر دو سو سواروں اور پیادوں کے ساتھ شریک ہوا، اور بودھن نامی ایک شخص نے بندوق سے اس کا کام تمام کیا (واقعات وحادثات مبارکپور قلمی ص ۱۸ ۲۵ جون ۱۸۹۳ء (۱۰ ذوالحجہ ۱۳۱۱ھ) میں گئو کشی کے بارے میں مئو جنگ ہوئی جس میں اس علاقہ کے لوگ کثیر تعداد میں شریک تھے، اور اگست ۱۸۹۳ء میں سورج پور کے چند لوگوں نے بجائے خویش کلکٹری اور ججی کے عہدے مقرر کئے اور داروغہ وچپراسی مقرر کرکے قریب کے دیہات کے مویشی پکڑے اور ان پر جرمانے کئے، بعد میں یہ لوگ گرفتار ہوئے (اخبار الوقت گورکھپور ۸ اگست ۱۸۹۳ء) ۱۹۴۲ء کے اندولن میں مدھوبن سے بلیا تک انگریزی حکومت ہفتوں عملاً ختم رہی۔

میں پیش آیا تھا، اور انہوں نے اس کے بعد مادی طاقت کے بجائے روحانی اور اخلاقی طاقت استعمال کرکے اس علاقہ کے سرکشوں اور ظالموں کو زیر کیا، خاص طور سے راجہ کہلوا کو اپنے تصرفات باطنی سے مطیع کیا، جو اس دیار میں سرکشی اور شر و فساد میں پیش پیش تھا۔

ہندوستان کے صوفیہ و مشائخ نے اپنی روحانی اور اخلاقی تلوار سے عوام کے دلوں کو فتح کر کے ان میں باہمی محبت کا بیج بویا ہے اور بادشاہوں کے تخت و تاج کے سامنے نہ جھکنے والی گردن نے ان کے آستانوں پر اپنے اپنے عقیدہ و انداز کے مطابق عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کئے ہیں، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، راقم نے مدھوبن میں کئی مقامی لوگوں سے کوہوابن کا راستہ پوچھا مگر سب نے کوہوابن نام کی بستی سے لاعلمی ظاہر کی اور جب اس کے ساتھ "درگاہ" ملایا تو سب نے بتادیا کیونکہ اس بستی کو صرف درگاہ کہتے ہیں۔

میر سید احمد بادپا کے آستانہ کی تقدیس و احترام میں یہاں کے خدام اور واردین و صادرین کے لئے جاگیریں اور معافیاں عطا کی گئیں اور اس دیار کے ہر حکمران نے ان کی تصدیق و توثیق کے لئے سند اور تمسک نامہ دیا ہے، آخری دور کی چند سندیں اب تک موجود ہیں، جن میں دو سندیں بادشاہ غازی عالمگیر کے حاکم الہ آباد فضل علی خاں کی مہر و تصدیق سے ہیں، ایک سند پر سنہ ۱۱۶۲ فصلی اور دوسری سند پر سنہ ۱۱۹۴ فصلی ہے، تیسری سند حیدر بیگ خاں کی مہر سے ہے، اس پر سنہ ۱۱۸۰ھ ہے، چوتھی سند حسین علی خاں کی مہر سے ہے، اس پر ۱۱۷۵ھ درج ہے، پانچویں سند راج کمار تنھو سنگھ کنور بہادر کی مہر سے ہے اس پر سنہ ۱۲۰۰ھ ہے، اور چھٹی سند نواب آصف الدولہ کے دور حکومت کے "خادم شرع احمد عربی قاضی سید حسن علی" کی مہر تصدیق سے ہے، اس پر سنہ ۱۲۱۰ھ درج ہے۔

افسانہ اور حقیقت یہاں تک لکھنے کے بعد کچھ اور مراجع و منابع ملے جن سے اس سلسلہ کی مزید

باتیں معلوم ہوتی ہیں، مناسب ہے کہ ان کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے تذکرۃ المتقین فی احوال خلفائے حضرت سید بدیع الدین مصنفہ سید امیر حسن مداری میں ہے کہ شاہ مدار نے بی بی نصیبہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم کو دو فرزند صاحب اقبال عطا فرمائے گا، تم بڑے لڑکے کو میرے حوالہ کرنا اور چھوٹے لڑکے کو اپنے پاس رکھنا، جب شاہ مدار دوبارہ بغداد گئے تو دونوں لڑکے پیدا ہو چکے تھے، سید محمد اور سید احمد، اتفاق سے سید محمد بالاخانہ سے گر کر مر گئے اور شاہ مدار کی دعا سے پھر زندہ ہو گئے، اس کرامت کو دیکھ کر بی بی نصیبہ کے یہ دونوں صاحبزادے سید محمد اور سید احمد اور بھتیجے میر شمس الدین حسن عرب، اور میر رکن الدین حسن عرب شاہ مدار کے حلقۂ ارادت میں آ کر ان کے ساتھ ہو گئے، اور کربلا ہوتے ہوئے نجف اشرف آئے، یہاں شاہ مدار سید جلال الدین وغیرہ کو اعتکاف میں بٹھا کر خود عازم ہند ہوئے، اور سیر و سیاحت کرتے ہوئے اجمیر کی کوکلا پہاڑی پر معتکف ہو گئے۔[1]

اور دوسری جگہ ہے کہ شاہ مدار نے شہر اجمیر پہونچکر سید جلال الدین اور سید احمد کو گوکلا پہاڑی پر اعتکاف میں بٹھایا اور خود کالپی کی طرف روانہ ہوئے۔[2]

ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد اور سید احمد حقیقی بھائی اور بی بی نصیبہ کے فرزند تھے، اور سید محمد بعد میں سید جلال الدین کے نام سے مشہور ہوئے، تذکرۃ المتقین کے حاشیہ پر ایک کتاب ہے جس کا نام اور مصنف معلوم نہ ہو سکا، اس میں ہے کہ:

و سید جمال الدین و سید احمد الدین فرزندان	سید جمال الدین اور سید احمد الدین
سید محمود بودند، نام مادر ایشان بی بی	دونوں سید محمود کے لڑکے تھے، ان
نصیبہ دختر ابو صالح، ہمشیرہ سید محی الدین	کی ماں بی بی نصیبہ ابو صالح کی دختر

[1] تذکرۃ المتقین ص ۴۵ مطبع قیومی کانپور [2] تذکرۃ المتقین ص ۴۷

عبدالقادر جیلانی است، وقتیکہ حضرت قطب المدار بمیر موصوف در بغداد بایک دیگر ملاقات فرمودہ بودند، میر موصوف قدس اللہ اسرارہم میر جلال الدین و سید احمد را حوالہ و تسلیم حضرت شاہ مدار نمودند کہ ایں مردان از شما بہرہ مند خواہند شد، ولقب بایں پا از آنست کہ چہل سال بپائے چپ لبیک گویان استادہ اند وسید جمال الدین را جان من جنتی ازاں گویند کہ روزے حضرت شاہ مدار بر کوہ اجمیر نشستہ بودند بمجرد دیدنش فرمودند کہ جان من جنتی است، ہمدردان ساعت علم اولین و آخرین برد مکشوف شد۔[1]

اور سید محی الدین عبد القادر جیلانی کی ہمشیرہ تھیں، جس وقت شاہ مدار اور میر سید محمود دونوں ایک دوسرے سے ملے، میر سید محمود نے سید جلال الدین اور سید احمد کو شاہ مدار کے سپرد کیا اور کہا کہ یہ دونوں آپ کے فیض سے بہرہ مند ہوں گے۔ اور (سید احمد کا) لقب بائیں پا اس لئے ہے کہ وہ چالیس سال تک بائیں پیر پر کھڑے ہو کر لبیک کہتے رہے ہیں اور سید جلال الدین کو جان من جنتی اس لئے کہتے ہیں کہ ایک دن شاہ مدار اجمیر کے پہاڑ پر بیٹھے تھے اسی حال میں انہوں نے سید جلال الدین کو دیکھتے ہی کہا کہ جان من جنتی ہے اور اس وقت تمام علوم اولین و آخرین ان پر منکشف ہو گئے۔

یہاں پر سید جمال الدین جان من جنتی سے مراد سید جلال الدین عرف سید جمن ہیں جن کا مزار

[1] حاشیہ تذکرۃ المتقین ص۶۔

ہلیسہ میں ہے، اسی کتاب میں شاہ مدار کے بارہ جلیل القدر خلفاء اور ان کے مزارات کا ذکر ہے، اسی سلسلہ میں ہے کہ:

دوازدہم سید احمد بائیں پا کہ دوازدہ سال لبیک گویان برپائے چپ ایستادہ و پائے راست بر زمین نہ نہاد قبرے در سواد کولہوا بن است، کامل کہ در عصر ہمایوں پادشاہ بود۔[1]

بارہویں خلیفہ سید احمد بائیں پا ہیں، جو بارہ سال تک لبیک کہتے ہوئے بائیں پیر پر کھڑے رہے اور دایاں پیر زمین پر نہیں رکھا، ان کی قبر سواد کولہوا بن میں ہے، وہ ولی کامل ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں تھے۔

اس عبارت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) اوپر کی عبارت میں ہے کہ چالیس سال تک بائیں پیر پر کھڑے رہے اور یہاں یہ ہے کہ بارہ سال تک کھڑے رہے، (۲) ان کی قبر کے کہلوا بن میں ہونے کی تصریح ہے، (۳) اور وہ سلطان ہمایوں کے عہد (۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ) میں موجود تھے، اور تذکرۃ المتقین میں ہے کہ سید جلال الدین جان من جنتی متوفی ۹۵۱ھ کے وقت میں شیر شاہ سوری موجود تھا، وہ مقام ہلیسہ کے قریب دفن ہیں۔[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائی ہمایوں اور شیر شاہ کے زمانہ میں موجود تھے، اور سید جلال الدین کی وفات ۹۵۱ھ میں ہوئی اسی کے آگے یا پیچھے سید احمد بادیا کی وفات بھی ہوئی ہوگی، میر سید احمد بادیا کے کہلوا بن میں مدفون ہونے کی ایک اور دلیل انتصاح عن ذکر اہل الصلاح مصنفہ شاہ علی انور قلندر میں ہے۔

و حضرت میر سید احمد بادیا کہ در جنگل کہلوا بن نواحی شہر جونپور آرامگاہ اوست، یعنی

[1] حاشیہ تذکرۃ المتقین ص۱۲ و ص۱۳ [2] تذکرۃ المتقین ص۱۳۴۔

میر سید احمد باد پا کی آرامگاہ شہر جونپور کے اطراف میں کہلو ابن کے جنگل میں ہے۔[1]

مذکورہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ مدار معمر ترین مشائخ میں سے تھے اور کئی سو سال تک زندہ رہے، اور میر سید جمال الدین اور میر سید احمد دونوں بھائی ہیں اور بی بی نصیبہ کے فرزند ہیں، اور یہ دونوں صاحبزادے شاہ مدار کے ساتھ ہندوستان آئے، ان کا اصلی وطن بغداد تھا۔

ان باتوں کی حیثیت افسانہ کی معلوم ہوتی ہے جس کی دلیل خود شاہ مدار کا بیان ہے جیسا کہ فصول مسعودیہ میں ہے کہ آخری عمر میں شاہ مدار نے اپنے خلفاء کو وصیت و نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ

باز گفت کہ شما را نیک معلوم است کہ	تم لوگوں کو خوب معلوم ہے کہ اس آخری
دریں زمانہ آخر از صد سال کسے زیادہ	زمانہ میں کوئی شخص سو سال سے
دریں عالم نمی ماند، و مارا حق سبحانہ	زیادہ اس دنیا میں نہیں رہا ہے،
تعالیٰ از کرم و فضل خود یکصد و بست	اور ہم کو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے
و پنج سال در عالم کون نگاہ داشت،	فضل و کرم سے ایک سو پچیس (۱۲۵) سال
ازاں جملہ قریب سی و پنج سال در	اس دنیا میں بحفاظت رکھا، ان میں
ولایت شام گزرانیدم، و قریب چہل	سے پینتیس سال میں نے ملک
سال در دیار مکہ معظمہ و مدینہ، رسول	شام میں گزارے اور قریب چالیس (۴۰)
خدا و نجف علی مرتضیٰ بسر بردہ انواع	سال مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور نجف
علوم حاصل نمودہ بطریق صراط مستقیم	میں رہ کر قسم قسم کے علوم حاصل کئے
حتی الامکان بسر سلوک نمودم، و قریب	اور حتی الامکان صحیح راستہ پر چل کر راہ
پنجاہ سال ست کہ در ممالک ہندوستان	سلوک طے کیا، اور قریب پچاس (۵۰) سال

۱؎ انتصار ص ۹۸

بصحبت و رفاقت شما راحت و ذوق	سے ہندوستان کے شہروں میں تم
گرفتیم الخ	لوگوں کی صحبت و رفاقت کا لطف
	لے رہا ہوں۔

اس کے بعد معاً صاحب فصول مسعودیہ لکھتے ہیں کہ شاہ مدار کا وصال روز پنجشنبہ تاریخ ۱۸ اٹھارہ ماہ جمادی الاولیٰ ۸۴۰ھ میں بعہد سلطان ابراہیم شرقی ہوا، ان کی ولادت ۷۱۵ھ میں ملک شام میں ہوئی تھی، اور ایک سو پچیس سال عمر پائی، گویا ۷۱۵ھ میں ملک شام میں جلوہ نما ہوئے اور ایک سو پچیس سال تک کسب کمالات کیا اور ۸۴۰ھ میں وفات پائی۔[1]

ان تصریحات کی رو سے شاہ مدار کی حضرت محی الدین عبد القادر جیلانی رح متوفی ۵۶۱ھ سے نہ ملاقات ہوئی اور نہ ان کی ہمشیرہ بی بی نصیبہ اور ان کے صاحبزادوں کا قصہ صحیح ہے، اور نہ ہی شاہ مدار کی غیر معقول درازیٔ عمر کی تصدیق ہوتی ہے، اور میر سید احمد باد پا کے بارے میں اس سلسلہ میں جو باتیں بیان کی جاتی ہیں سب بے بنیاد ہیں، بس اتنا ہے کہ شاہ مدار کے بارہ مشاہیر خلفاء میں سے ہیں اور ان کا مزار کہلو ابن میں ہے۔

۱؎ فصول مسعودیہ از شاہ مسعود علی قلندر ص ۲۱۱ و ص ۲۱۲۔

قرآن وسنّت کا باہمی ربط

از

مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(شکاگو (امریکہ) کی "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے زیر اہتمام اکتوبر ۸۹ء میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، یہ مقالہ اس میں پڑھا گیا تھا" (معارف)

اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور رحمت تامہ نے انسانی ہدایت و رہنمائی کے لئے آدم و نوح علیہما السلام سے لے کر آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بے شمار انبیاء و رسل مبعوث کئے جن پر آسمانی صحیفے اور کتابیں نازل فرماکر یہ سلسلہ اپنے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آخری کتاب قرآن مجید پر ختم فرمادیا۔

آخری رسول کے بعد نبوت کا سلسلہ کیوں ختم کر دیا گیا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخری نبی کے آجانے اور آخری کتاب کے اترنے کے بعد کیا ہمیشہ کے لئے انسانوں کی گمراہی ختم اور باطل پرستی کی بیماری معدوم ہوگئی؟ اگر ایسا نہیں ہوسکا اور مشاہدہ ہے کہ نہیں ہوا تو پھر ہادیٔ مطلق اور قادر و حکیم نے جس کی تمام صفات ازلی و ابدی ہیں اپنی رحمت کا نزول جدید آسمانی کتاب اور نئی نبوت و رسالت کی شکل میں کیوں بند کر دیا ہے؟ اس سوال کا مختصر جواب سورہ مائدہ کی اس مشہور آیت میں مل جاتا ہے جس کے نازل ہونے پر بعض سمجھدار یہودیوں نے کہا تھا کہ اگر یہ ہمارے یہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم ہر سال اس کی یادگار منایا کرتے۔[1] "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً"۔

[1] بخاری ج ۲ ص ۶۶۲

اس میں گویا یہ بتادیا گیا ہے کہ قیامت تک ہر طرح کی گمراہی سے بچانے اور سیدھی راہ دکھانے کے لئے یہی کامل دین کافی ہے کسی اور نئے دین کی یا اس دین میں اضافہ کی اب نہ ضرورت ہے اور نہ کوئی گنجائش۔ اس بات کو تمثیل کے پیرایہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں طور بیان فرمایا ہے کہ "میری اور دوسرے انبیاء کی مثال ایسی ہے کہ جیسے بہت اچھا محل بنایا گیا ہو لیکن اس میں صرف ایک اینٹ کی جگہ رہ گئی ہو، میں نے وہی جگہ پر کی ہے۔"[1]

یہ فطری بات ہے کہ جب کسی عمارت میں ہر موسم کی رعایت، ہر مزاج کے لوگوں کے لئے ہر قسم کی راحت و ضرورت پورا کرنے کی صلاحیت اور ہر خطرہ سے حفاظت کا پورا سامان کر دیا جائے اور وہ ہر لحاظ سے مکمل ہوجائے تو اس کے بعد بس اس کی حفاظت و بقا اور اسے کہنگی و فرسودگی سے صرف بچانے ہی کا مسئلہ رہ جاتا ہے اس میں کسی اضافہ اور مزید تعمیر کے نئے ساز و سامان اور معمار کی ضرورت باقی نہیں رہتی، چنانچہ اس جامع و مکمل دین کے بارے میں باقی رہنے والی واحد ضرورت حفاظت کا انتظام اور اس کا تکفل خود اس کے بھیجنے والے قدیر و خبیر خدا نے اپنے ذمہ لے لینے کا اعلان اپنی حکیم و محکم کتاب قرآن مجید کی سورۃ الحجر کے اندر (وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ) کے الفاظ میں فرمادیا ہے لیکن اس عالم کون و فساد اور جہان آب و گل میں خداوند تعالیٰ کے ارادہ و قدرت کا ظہور کسی سبب کے پردہ ہی میں ہوا کرتا ہے مثلاً بارش کا نزول بادل سے، رزق کی عطا زمین کی پیداوار سے، روشنی و حرارت سورج سے اور زندگی کی بقا سانس کی آمد و رفت سے وابستہ کر دی گئی ہے، مادی دنیا و جسمانی معاملات کی طرح روحانی عالم اور معنوی امور میں بھی یہی سنۃ اللہ کارفرما نظر آتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو امت کے سامنے قرآن حکیم کی تلاوت کرنے کا حکم دیا ہے اور امت کو ٹھیک اس کے نقل و بیان کی تاکید فرمائی ہے جس کے نتیجہ میں قرآن مجید کی صحیح تلاوت اور قرأت کی حفاظت

[1] مشکوٰۃ شریف ج ۲ ص ۵۱۱ بحوالہ بخاری و مسلم۔

کے لئے زمانہ نزول قرآن سے لے کر آج تک بلکہ قیامت تک لاکھوں حفاظ کے سلسلہ کا ہر زمانہ کے اندر باقی رہنا اور کسی بھی قلیل سے قلیل عرصہ کے لئے اس اہتمام سے دنیا کے کسی گوشہ کا خالی نہ ہونا' دراصل اسی سنۃ اللہ کی نمایاں شکلیں یا بالفاظ دیگر "وانا لہ لحافظون" کی عملی تفسیریں ہیں۔

کتاب کی حفاظت کے وعدہ میں اس کی تشریح کی بھی حفاظت شامل ہے

اگر کسی بھی کتاب یا پیغام وکلام کے صرف الفاظ اور ظاہری قالب کا محفوظ رہنا اس وقت تک چنداں سود مند اور کارآمد نہیں ہوتا جب تک کہ اس کلام و پیغام یا کتاب کے معانی و مفاہیم کی حفاظت و بقا کا بھی ایسا ہی بلکہ اس سے بڑھ کر انتظام و اہتمام نہ ہو' کیوں کہ الفاظ تو ذریعہ اور وسیلہ کا درجہ رکھتے ہیں اصل چیز وہ معانی و احکام ہیں جو کلام کے پیرایہ میں پیش کئے اور الفاظ کا جامہ پہنا کر اتارے گئے ہیں کہ معانی پر ہی افادہ و استفادہ اور ہدایت و رہنمائی کا دارومدار ہے۔ اس لئے اگر خدانخواستہ صحیح معانی و مراد کے تعین نیز اس کی حفاظت کا بندوبست نہ ہوتا تو الفاظ کے بقاء و تحفظ کا اہم مقصد ہی فوت ہو جاتا اس بنا پر اللہ حکیم وعزیز کی حکمت سے یہ بعید تھا کہ وہ الفاظِ قرآن کی حفاظت و بقا کا تو ایسا بندوبست کرے جس پر اپنے ہی نہیں غیر بھی انگشت بدنداں ہوں اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس کے بالکل اصلی حالت پر باقی رہنے کی حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور رہوں' لیکن وہی قادر و مختار خدا اپنی کتاب ہدایت کے معانی و مراد کے تحفظ کا انتظام نہ کرے؟ یہ بات جس طرح عقل و قیاس کے خلاف ہے اسی طرح حقیقت واقعہ کے بھی منافی ہے۔

کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو کتاب حکیم کی تلاوت (جو الفاظ کی حفاظت کا اہم ذریعہ ہے) کے ساتھ ہی اس کی تعلیم کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ جن آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری تلاوت بتائی گئی ہے ان ہی میں تعلیم کا بھی اسی انداز میں ذکر ہے۔ مثلاً ایک آیت میں ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران : ۱۶۴)

حقیقت میں اللہ نے (بڑا) احسان مسلمانوں پر کیا جب کہ ان ہی میں سے ایک پیغمبر ان میں بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔

ظاہر ہے کہ "تعلیم" "تلاوت" سے الگ چیز ہے ورنہ علیحدہ علیحدہ دونوں کا ذکر بلاوجہ تکرار کا موجب ہوتا جو عربی زبان کے لحاظ سے ایک عیب ہے اور قرآن مجید ہر عیب سے پاک ہے۔

'تعلیم کتاب' سے کیا مراد ہے

"تعلیم کتاب" کا مطلب آیاتِ کتاب کی تشریح' ان کے معانی و مطالب کی توضیح اور ان سے معلوم ہونے والے احکام کا بیان ہے اس سے یہ بھی خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں جس طرح تلاوتِ کتاب (الفاظ وکلمات کا سنانا) ہے اسی طرح اس کے معانی و مطالب کی تشریح اور مراد کی تعیین بھی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس طرح قرآن مجید کے الفاظ و عبارت حجت ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تشریحات و بیانات بھی حجت ہیں جو آپ نے تعلیم کتاب کے سلسلہ میں صادر فرمائے ہیں پھر قرآن مجید کے الفاظ و عبارت کی بقا و حفاظت کی ذمہ داری کے اندر ان مطالب و تشریحات کی بقا و حفاظت کی ذمہ داری بھی شامل ہو جاتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ورنہ قرآن مجید کے صرف الفاظ و عبارت کی بقا و حفاظت کی اصل غرض فوت ہو جائے گی۔ کیونکہ تشریح کے بغیر کتاب ہدایت سے رہنمائی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

سنت کے بغیر قرآن مجید پر عمل کرنا ممکن نہیں

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تشریحات کے بغیر قرآن مجید سے استفادہ اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ممکن نہیں اگر ایسا ممکن ہوتا تو کتاب ہدایت کے ساتھ نبی ہدایت بھیجنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی صرف کتاب ہی کا نازل کر دینا کافی ہوتا، کتاب اللہ کی صحیح مراد معلوم کرنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ظہر کی چار رکعتیں مغرب کی تین رکعتیں۔ اسی طرح روزہ کی حقیقت کھانے پینے کی ممانعت۔ پانچویں صدی ہجری کے مشہور ترین وسیع النظر مغربی عالم علامہ ابو محمد علی بن حزم نے حدیث کی ضرورت سے انکار کرنے والوں کو مخاطب کرکے اس مسئلہ پر بہت خوب بحث کی ہے۔[1]

علاوہ ازیں خود قرآن مجید میں ایک سے زیادہ آیات کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذمہ داری کتاب اللہ کی تشریح و تبیین بتائی گئی ہے، مثلاً فرمایا "وَاَنزَلنَآ اِلَیکَ الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیھِم" (نحل ۴۴) اس میں اور اس مضمون کی دوسری آیتوں میں تو صاف انداز اور واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی لئے نازل کیا گیا ہے کہ آپ اس کے مطالب کی تشریح اور مراد کی تعیین فرمائیں کیوں کہ اس کے بغیر لوگ قرآن مجید پر عمل کر ہی نہیں سکتے، اس بنا پر یہ کہنا اور سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "تعلیم کتاب" کی جو ذمہ داری سونپی گئی ہے اس کا مطلب یہی تبیین و تشریح ہے۔

تشریح کے بغیر مراد تک رسائی ناممکن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے بغیر تنہا قرآن مجید کی عبارت سے پورا مطلب، عام اہل زبان ہی نہیں صحابہ تک کے لئے سمجھنا مشکل بلکہ ناممکن ہونے کا ثبوت ان واقعات سے بھی ملتا ہے جو آیات کے مفاہیم سمجھنے کی کوشش اور تشریح

[1] ملاحظہ ہو احکام الاحکام ۲/۸۰-۸۹

کی فرمائش کے سلسلہ میں صحابہؓ کے بکثرت ملتے ہیں یہاں ان میں سے صرف چند ہی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) جب قرآن مجید کی روزہ کے سلسلہ میں یہ آیت "کُلُوا وَاشرَبُوا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الخَیطُ الاَبیَضُ مِنَ الخَیطِ الاَسوَدِ" نازل ہوئی تو حضرت عدی بن حاتمؓ نے خیط کے ظاہری معنی سمجھ کر دو دھاگے ایک سیاہ اور ایک سفید رکھ کر ختم سحری کا وقت دریافت کرنے کی کوشش کی، ظاہر ہے کہ یہ کوشش مراد خداوندی کے خلاف تھی چنانچہ ان کی غلطی کی اصلاح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ اس سے مراد دھاگہ نہیں بلکہ فجر یعنی صبح صادق کا طلوع ہے غور کیجئے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی غلط فہمی کا علم نہ ہوتا اور آپ اس لفظ کی تشریح نہ فرماتے تو وہ صحابی اور نہ جانے کتنے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہ کر صبح صادق کے بعد تک کھاتے پیتے رہتے۔ اس طرح وہ لوگ صورۃً روزہ رکھنے کے باوجود حقیقتاً روزہ کے بغیر دن گزارتے نتیجۃً ایک اہم فریضہ کی عدم ادائیگی کے مرتکب ہوتے۔ یہ واضح رہے کہ آپؐ کی یہ تشریح اس آیت کے آخری جز "مِنَ الفَجرِ" پر مبنی ہے جو بعد میں نازل ہوا۔ اگر پہلے جز کے ساتھ ہی یہ جز بھی نازل ہوگیا ہوتا تو اس غلط فہمی کی گنجائش نہ ہوتی۔

(۲) سورۃ "الزمر" کی آیت "یَومَ تُبَدَّلُ الاَرضُ غَیرَ الاَرضِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطوِیّٰتٌ بِیَمِینِہٖ" جب نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ جب زمین کی موجودہ حالت بدل جائے گی اور آسمان بھی لپیٹ دیئے جائیں گے جس کے درمیان ساری مخلوق سمائی ہوئی ہے جب یہ دونوں نہ ہوں گے تو اس وقت خدا کی مخلوق خاص طور پر انسان کہاں ہوں گے؟ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "پل صراط پر" ہوں گے۔

(۳) قرآن مجید میں حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں کہا گیا ہے "یَا اُختَ ھٰرُونَ مَا کَانَ اَبُوکِ امرَاَ سَوءٍ وَّمَا کَانَت اُمُّکِ بَغِیًّا" اس پر صحابہ کرامؓ کو یہ اشکال

ہوا کہ ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور مشہور نبی ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ مریمؑ کی پیدائش سے مشہور قول کے مطابق ڈیڑھ ہزار سال پہلے گزرے ہیں تو پھر مریم کو ہارون علیہ السلام کی بہن کہنا کیوں کر صحیح ہوگا؟ اس لئے کہ بھائی بہن کی عمر میں ڈیڑھ ہزار سال کا تفاوت عادتاً محال ہے۔ اس کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیا کہ صالحین کے نام پر نام رکھنے کا رواج تھا اس لئے یہاں مشہور نبی 'ہارون' مراد نہیں بلکہ ان کے ہم نام دوسرے شخص مراد ہیں۔

(۴) واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین (سورۃ الحجر) میں "الیقین" کے اگر لغوی معنی مراد لئے جائیں تو پھر اس سے ملاحدہ کا عقیدہ ثابت ہو جائے گا کہ "یقین" یعنی کشف وشہود کی کیفیت حاصل ہونے کے بعد انسان عبادات کا مکلف نہیں رہتا، اس تشریح کو درست ماننے کے بعد تمام احکام شرعیہ سے دست برداری کی راہ کھل جائے گی اور پورا قرآن مجید ہی معطل ہو کر رہ جائے گا البتہ اگر 'یقین' کی تفسیر موت سے کی جائے جو متعدد صحابہ وتابعین حضرت عبداللہ بن عمر، حسن، قتادہ وغیرہ سے منقول ہے ظاہر ہے کہ ان حضرات نے یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی اور بیان کی ہوگی، اس کو اختیار کرنے کے بعد اس ملحدانہ مفہوم کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

احادیث کے بغیر بعض آیات کا ظاہری مفہوم بھی سمجھنا ناممکن ہے

اوپر جو مثالیں ذکر کی گئیں وہ یہ حقیقت ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اہل زبان ہونے اور زمانہ نبوت میں رہنے اور آیات کا ظاہری مفہوم سمجھنے کے باوجود قرآن مجید کی حقیقی مراد کا پانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و تشریح کے بغیر ممکن نہیں بلکہ یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات کا مکمل ظاہری مفہوم سمجھنا احادیث کے بغیر ممکن نہیں، اس کی مثالیں بکثرت ہیں چند ملاحظہ ہوں۔

(۱) فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا
(سورۃ الاحزاب: ۳۷)

پھر جب زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کر لی تو ہم نے اس کا تجھ سے نکاح کر دیا۔

احادیث میں اس واقعہ کی تفصیل دیکھے بغیر مجرد آیت سے اس کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔

(۲) وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى	اور جب کہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا
الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ	کہ دو جماعتوں میں سے کوئی جماعت تم
اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ	کو ہاتھ آئے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ
لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ	بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے
بِكَلِمٰتِهٖ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ	اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں
لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ۔	سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ
(الانفال آیت ۷، ۸)	دے خواہ مجرموں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں بھی واقعات کی تفصیل معلوم کئے بغیر آیت کی اصل حقیقت مخفی رہے گی۔

(۳) وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ	اور جن اہل کتاب نے انکی مدد کی تھی ان کو انکے
مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ	قلعوں سے نیچے اتار دیا اور انکے دلوں میں
وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ	تمہارا رعب بٹھا دیا، بعض کو تم قتل کرنے لگے
فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ	اور بعض کو قید کر لیا اور ان کی زمین اور
فَرِيْقًا وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ	ان کے گھروں اور ان کے اموال کا تم کو مالک
وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا	بنا دیا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے
لَّمْ تَطَئُوْهَا (سورۃ الاحزاب ۲۷)	قدم نہیں رکھا۔

واقعات کی تفصیل کے بغیر ان امور کے بارے میں بھی کوئی واقفیت نہیں ہو سکتی؟ ان مثالوں سے واضح ہے کہ قرآن مجید کی مراد تک رسائی اور اللہ تعالیٰ کا منشا معلوم کرنے کے لئے اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح وتبیین کے بغیر چارہ نہیں اور اسی سے خود بخود یہ بھی

ثابت ہو جاتا ہے کہ کتاب اللہ کی حفاظت کے وعدۂ خداوندی کے اندر تشریحات نبوی کی حفاظت بھی شامل ہے، اس کی واقعاتی شہادتوں کا ذکر آگے آئے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب قرآن مجید ایک جامع ومکمل کتاب ہے تو پھر اس کی تشریح وبیان کی ضرورت ہی کہاں ہے؟ لیکن معمولی غور وفکر اور مطالعہ سے اس سوال کا جواب بآسانی مل سکتا ہے ظاہر ہے کہ کسی بھی کتاب کے جامع ومکمل یا واضح ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر جز اتنا واضح ہے کہ ہر جاہل وعالم، شہری ودیہاتی کی سمجھ میں بغیر کسی کی مدد اور شرح کے آجائے، آج تک کوئی بھی کتاب ایسی 'جامع ومکمل' وجود میں نہیں آئی بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ بہتر سے بہتر کتاب کے بھی بعض مقامات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اسی زبان کے جاننے والوں بلکہ ان ماہرین کو بھی کہ جن کی زبان میں کتاب ہے۔ شرح وبیان کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بغیر حقیقی مفہوم تک رسائی ممکن نہیں ہوتی، حتیٰ کہ 'لغت' کی کتابوں میں بھی یہ ضرورت تسلیم کی گئی ہے، حالانکہ 'لغت' میں شرح کی ضرورت کا باقی رہنا مشکل ہی سے کسی ناواقف کی سمجھ میں آسکتا ہے لیکن ایک نہیں ہر زبان کی درجنوں ایسی ڈکشنریاں موجود ہیں جن کی شرحیں لکھی گئیں، عربی لغت کی مشہور ترین کتاب "القاموس" کی شرح "تاج العروس" سے کون عربی داں بے خبر ہوگا؟

جب اپنے ہی جیسے انسانوں کی لکھی کتابوں کا یہ حال ہے کہ وہ شرح وبیان کے بغیر نہ پوری طرح سمجھی جاسکتی ہیں اور نہ ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے تو احکم الحاکمین کی کتاب حکیم کے بارے میں اس گمان کو کہ اسے بغیر کسی شرح وتفسیر کے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے، بے دانشی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو کتاب جتنی زیادہ اہم ہوتی ہے اکثر اتنی ہی زیادہ اس کے سمجھنے میں شرح وبیان کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کسی کتاب کی اہمیت کے لئے ایک طرح کا یہ معیار بن گیا ہے کہ اس کی شرحیں کتنی ہیں! چنانچہ جس کتاب کی

جتنی زیادہ شرحیں ہوں عموماً وہ اتنی ہی زیادہ اہم تسلیم کی جاتی ہے۔ اس ہمہ گیر صورت حال کو پیش نظر رکھ کر یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے سمجھنے کیلئے کسی کو بھی شرح وبیان کی ضرورت نہیں درحقیقت وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن مجید کوئی اہم کتاب نہیں ہے؟

اس کے علاوہ ان کے اس دعوے سے یہ بھی آشکارا ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کتاب حکیم کا یا تو مطالعہ ہی نہیں کیا یا پھر اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ورنہ انہیں اپنی عربی دانی کے ادعاء کے باوجود قدم قدم پر تشریح وتفسیر کی ضرورت محسوس ہوتی کیوں کہ اس کے بغیر صحیح مطلب تک رسائی ممکن ہی نہیں، جس کے ثبوت میں بطور مثال چند آیتیں بھی اوپر ذکر ہو چکی ہیں۔ یہاں صرف ایک اور آیت (اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ ؏ سورہ توبہ: ۳۴) کا اضافہ کرکے دریافت کرتے ہیں کہ اگر جائز طریقہ پر بھی جمع شدہ تمام مال راہِ خدا میں خرچ کرنا ضروری ہوتا جیسا کہ اس آیت کے ظاہر سے مفہوم ہو رہا ہے۔ تو پھر آیاتِ میراث ووصیت وغیرہ کا کیا موقع اور فائدہ ہوگا؟ اگر سارے مال کا راہ خدا میں خرچ کرنا ضروری ہوتا تو اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کا تمام مال ہی ان کے ورثہ کے بجائے راہ خدا میں ہی خرچ کرنے کا حکم دیا جانا چاہئے تھا جس طرح قرض کے بارے میں ہے کہ اگر تمام متروکہ مال کے بقدر قرض ہو تو ورثہ میں اسے تقسیم کرنے سے پہلے مورث کا قرض ادا کیا جائے گا۔ اور اسے قرآن مجید 'فریضہ' بتا رہا ہے (فَرِیْضَۃً مِّنَ اللّٰہِ۔ سورۃ النساء: ۱۱) لیکن احادیث سے بے نیاز لوگوں کے نزدیک تو اسے معصیت ہونا چاہئے تھا۔ نیز ان کے

؏ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ سونا چاندی (مال ودولت) اکٹھا کر رہے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے وہ سب عذاب الیم میں مبتلا ہوں گے۔

نزدیک ان دونوں آیتوں کے درمیان تضاد بھی ہوگا۔ مگر احادیث کو قرآن مجید کی شرح تسلیم کرنے والوں کو اس میں نہ کوئی اشکال پیش آئے گا اور نہ آیت میراث و آیت انفاق کے درمیان تضاد نظر آئے گا، کیونکہ ان کے سامنے یہ حدیث نبویؐ بطور شرح ہے۔ "ما بلغ أن تؤدى زكاته فزكى فليس بكنز"[1] یعنی زکاۃ صحیح طریقہ پر ادا کرنے کے بعد جو مال جمع ہو یا باقی رہ جائے، اس کا راہ خدا میں خرچ کرنا ضروری نہیں اور نہ اس کے جمع رہنے پر وہ وعید ہے جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے، دراصل احادیث کو قرآن مجید کی شرح نہ ماننے سے متعدد آیتوں میں تضاد دکھائی دے گا اور یہی 'تضاد'، لوگوں کو قرآن کو خدا کی کتاب نہ ہونے پر آمادہ کر دیتا ہے کیونکہ خود قرآن مجید نے بتایا ہے (وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ سورۃ النساء: ۸۲)

علاوہ ازیں تشریح کی ضرورت کا یہ انکار "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" جیسی آیات کی تکذیب اور ان کی غلط تاویل کا باعث بھی بنے گا۔

اس تفصیل کی روشنی میں بعض علمائے راسخین کے اس ارشاد پر:

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ ج ۱ ص ۲۱۸ (مطبع مجیدی کانپور) و احکام القرآن للجصاص ج ۳ ص ۱۰۶ (طبع دار الکتاب العربی۔ بیروت) ـــــ ابو داؤد ہی کی روایت کتاب الزکوٰۃ باب فی حقوق المال ج ۱ ص ۲۳۴ میں یہی بات صراحتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے۔ "قالوا یا نبی اللہ انہ کبر علی اصحابک ھٰذہ الآیۃ۔ الذین یکنزون الذھب ... الخ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لم یفرض الزکاۃ الا لیطیب ما بقی من اموالکم وانما فرض المواریث لتکون لمن بعدکم۔" مذکورہ روایت کی شرح کرتے ہوئے مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: "انما ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المواریث بعد الزکاۃ لیکون ادل

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

"الكتاب احوج الى السنة من السنة الى الكتاب"[1]

کتاب اللہ کی تشریح و تفسیر کے لئے سنت رسول اللہ کی زیادہ ضرورت ہے۔

کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ امام اوزاعیؒ نے حسان بن عطیہ سے نقل کیا ہے۔

كان الوحي ينزل على رسول الله صلى الله عليه وسلم و يحضره جبريل بالسنة التي تفسره۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی اور جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آتے اور اس کی تفسیر بتاتے۔

امام ابراہیم بن موسیٰ ابو اسحٰق شاطبی (م ۷۹۰ھ) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "الموافقات" میں اس حقیقت افروز قول کی تشریح اس طرح کی ہے۔[2]

لأن الكتاب يكون محتملا لأمرين فأكثر فتأتي السنة بتعيين أحدهما فيرجع الى السنة۔

چونکہ کتاب اللہ (کی عبارت) میں ایک سے زیادہ احتمال کی گنجائش ہوتی ہے سنت اس میں سے ایک معنی متعین کر دیتی ہے پھر اس کو (عمل کے لئے) اختیار کیا جاتا ہے۔

اور یہ بات خود قرآن مجید کی متعدد آیات سے مستفاد ہے، حضرت عمران بن حصین نے اپنے زمانہ کے ایک شخص کو جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ "ان کتاب اللہ ابھم ھٰذا وان السنۃ تفسر ذلک۔"[3] اسے (نماز کی تعداد رکعت اور اوقات وغیرہ کو) قرآن مجید

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸ کا) علی ان جمع الاموال وکنزھا لیس بممنوع شرعاً ولو کان ممنوعاً لما شرع المیراث لان المیراث لا یجری الا فی الاموال المخزونۃ (بذل المجہود ج ۸ ص ۲۰۹ طبع قاہرہ)

[1] الموافقات للشاطبی ج ۴ ص ۲۶ [2] ایضاً ج ۴ ص ۸ (طبع دار المعرفۃ۔ بیروت) [3] ایضاً ج ۴ ص ۲۶

میں مبہم رکھا گیا البتہ سنت نے اس کی تفصیل کر دی۔

نیز اسی طرح مشہور تابعی حضرت مطرفؒ بن شخیر نے ایک ایسے شخص کو جو کہتا تھا کہ قرآن کے سوا کچھ اور مت بیان کیجئے متنبہ کرتے ہوئے یہ حکیمانہ جواب دیا:

واللہ ما نرید بالقرآن بدلا	ہم بھی قرآن مجید پر کسی اور چیز کو
ولکن نرید من ھو اعلم	ترجیح نہیں دیتے لیکن قرآن حکیم
بالقرآن۔[1]	کے سب سے زیادہ جاننے والے کی
	تشریح کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تشریحات نبویؐ کو نظر انداز کر کے اگر کوئی تفسیر کی جائے گی تو اس کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں۔

تاریخ کا سبق تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و بیان کو نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں متعدد گمراہ فرقے وجود میں آئے چنانچہ خوارج کا فرقہ قرآن مجید کی ایک آیت "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" کی من مانی تفسیر ہی کی بنا پر وجود میں آیا اسی طرح فرقہ قرامطہ بھی قرآن مجید کی آیات کی من مانی تفسیر ہی کے نتیجہ میں ظہور میں آیا[2] اور ہمارے زمانہ کا عظیم فتنہ "قادیانیت" بھی قرآن مجید کی آیت کے لفظ "خاتم النبیین" کی حدیث کے خلاف تشریح پر قائم ہے۔

امام عبد القاہر البغدادی (م ۴۲۹ھ) صاحب الفرق بین الفرق نے قرامطہ کو مسلمانوں کے لئے۔ یہود و نصاریٰ بلکہ دجال سے بھی بڑھ کر خطرناک اور مضرت رساں بتایا ہے انہوں نے اس

---

[1] الموافقات للشاطبی ج ۴ ص ۲۶ (طبع دار المعرفۃ۔ بیروت) [2] ان فرق باطلہ کے عقائد اور ان کی تحریفات کی تفصیل کیلئے "الملل والنحل للشہرستانی" اور الفرق بین الفرق وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

فرقہ کا حال تقریباً ۳۰ صفحوں میں بیان کیا ہے جس میں نبوی تشریحات کو نظر انداز کرنے کی عبرت ناک مثالیں موجود ہیں۔

عجیب مماثلت دراصل پہلی صدی سے لے کر آج تک کے سب فرق باطلہ احادیث کی حجیت سے انکار اور ان میں طعن کرنے کے یکساں طریقے پر گامزن رہے ہیں۔

قرآن مجید کی رو سے اطاعت رسول کی حیثیت قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا حکم بصیغہ امر "اَطِیْعُوْا" دیا گیا ہے (البتہ اس سلسلہ میں کہیں لفظ "الرسول" لایا گیا ہے اور کہیں "رسولہ") صیغہ امر کے علاوہ دوسرے اسلوب اور پیرایہ بیان میں بھی یہی بات کہی گئی ہے مثلاً "اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ" (الانفال) "فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَاِلَی الرَّسُوْلِ" (النساء) "فَاتَّبِعُوْنِیْ" (آل عمران) "وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَھْتَدُوْا" (النور) "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ" (الاحزاب: ۲۱) "مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ" (الاحزاب) "فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ" (النور) "اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" (المائدہ) "وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ وَغَوٰی"۔

غور کرنے کی بات ہے کہ قرآن مجید جیسی اہم اور اصولی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا صاف و صریح حکم اور نافرمانی پر وعید اتنی کثرت سے بتکرار کیوں ہے؟ کیا اللہ حکیم و علیم کی کتاب حکیم میں یہ تکرار، بے معنیٰ ہے یا جسے سمجھنے میں بہت بڑی ذہانت یا قابلیت کی ضرورت ہو بلکہ وجہ صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت کی اہمیت بتانا اور یہ ثابت کرنا کہ آپؐ کی اطاعت بھی اسی قدر ضروری اور اہم ہے جس قدر

خود اللہ کی۔ اکثر جگہ الگ الفاظ میں حکم دیا گیا ہے اسی سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دونوں کی حیثیت مستقل ہے ان میں سے کسی کی حیثیت تبعی اور ضمنی نہیں ہے اکثر علمائے راسخین نے بھی اس مسئلہ پر اپنی تصانیف میں بحث کی ہے۔ حافظ شمس الدین ابن قیم (متوفی ۷۵۱ھ) اپنی شہرہ آفاق کتاب اعلام الموقعین" میں تحریر فرماتے ہیں۔

فامر تعالیٰ بطاعته وطاعة	پس اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول
رسوله واعاد الفعل اعلاما	کی اطاعت کا حکم دیا اور فعل کا اعادہ
بان طاعة الرسول تجب	یہ بتانے کیلئے کیا ہے کہ رسول کی اطاعت
استقلالا من غير عرض ما	مستقل بالذات واجب ہے، اس کی
امربه على الكتاب بل اذا امر	حیثیت ضمنی اور تبعی نہیں ہے بلکہ
وجبت طاعته مطلقا سواء	جب بھی رسول کوئی حکم دے گا تو
كان ما امربه في الكتاب اولم	اس کی اطاعت مطلقاً واجب ہوگی
يكن فيه ... ولم يأمر بطاعة	خواہ اس کا حکم کتاب میں موجود ہو یا
أولى الأمر استقلالا بل حذف	نہ ہو... خدا نے اولوالامر کی
الفعل وجعل طاعتهم في ضمن	اطاعت کا حکم مستقلاً نہیں دیا ہے
طاعة الرسول ايذانا بأنهم	بلکہ فعل کو حذف کر دیا ہے اور ان کی
يطاعون تبعا لطاعة الرسول۔[1]	اطاعت کو رسول کی اطاعت کے ضمن میں
	یہ بتانے کیلئے کر دیا ہے کہ انکی جو اطاعت کیجائیگی
	وہ رسول کی اطاعت کے بالتبع ہوگی۔

۱؎ اعلام الموقعین لابن القیم ص ۵۲ ج ۱ حادی الارواح (مطبع النیل، مصر)

سنت کی قسمیں | حافظ ابن قیمؒ نے ایک دوسری جگہ مضامین کے اعتبار سے رسول کے احکام کی تین قسمیں بیان کی ہیں (۱) بعض وہ جن میں بعینہٖ وہی حکم بیان کیا گیا ہے جو قرآن مجید میں ہے۔ (۲) بعض میں قرآن مجید کے کسی مجمل کی مراد یا کسی لفظ کی تفسیر مذکور ہے ان دونوں قسموں پر عمل کرنے سے رسول کی اطاعت کے مستقل ہونے کی حیثیت کا اظہار نہیں ہوتا (۳) وہ جن میں وجوب یا حرمت کے ایسے احکام بیان ہوئے ہیں جن سے قرآن مجید نے سکوت اختیار کیا ہے ان احکام کے ماننے اور ان پر عمل کرنے ہی سے دراصل رسول کی اطاعت کے قرآنی حکم پر عمل ہوتا ہے۔ اگر ایسے احکام نہ ہوتے تو "اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" (رسول کی اطاعت کرو) کا مصداق ہی نہ رہتا، اور اسی قسم کے احکام میں رسولؐ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت فرمایا گیا ہے[1]۔ (وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ النساء: ۸۰)

اس موقع پر جلیل القدر محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہنا چاہیے۔

"اس حکم (اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ) میں "اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" کو "اَطِیْعُوا اللّٰہَ" سے الگ مستقل جملہ کی شکل میں قرآن مجید میں جس طرح مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے اس سے ہر وہ شخص جس کو عربی زبان کا کچھ بھی ذوق ہو یہی سمجھے گا کہ اللہ کی اطاعت کی طرح، اہل ایمان پر رسول کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے یعنی اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کتاب رسول لائے ہیں اس کو مانا جائے اور اس کے حکموں پر چلا جائے کیونکہ اگر صرف اتنی ہی بات کہنی ہوتی تو یہ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ" میں کہی جا چکی تھی پھر اطاعت کے مستقل اعادہ کے ساتھ "اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" کے اضافہ کی کیا ضرورت تھی؟ علاوہ ازیں خود قرآن مجید کی بعض دوسری آیات سے بھی یہ بات اور زیادہ صاف اور واضح ہو جاتی ہے[2]۔"

۱؎ "ترجمان السنۃ" (جلد اول ص۱۲۵) مکتبہ برہان دہلی ۲؎ "مقدمہ معارف الحدیث" (جلد اول

حکمت سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ذمہ داریاں بتائی ہیں ان میں "تعلیم کتاب" کے ساتھ "حکمت" کا ذکر بھی ہے۔ اور پھر اس حکمت کے نازل کرنے کا ذکر بھی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے: "اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" (سورۃ النساء) وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ (بقرہ) اور اسی کے ساتھ قرآن مجید ہی میں ازواج مطہرات کو اس حکمت کے "ذکر و تلاوت" کا حکم بھی دیا گیا ہے وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِیْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (الاحزاب) حکمت کے بارے میں سلف کے مختلف اقوال منقول ہیں بعض علماء کے نزدیک اس سے سنت مراد ہے امام شافعیؒ کا یہی قول ہے[1] بعض محدثین اور علامہ ابن تیمیہؒ سے بھی یہ قول منقول ہے[2]۔

ان سب امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد بدیہی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ "قرآن" کے علاوہ سنت رسول بھی واجب العمل اور اسوۂ رسول بھی واجب الاتباع ہے یعنی جس طرح قرآن مجید پر عمل کے بغیر صاحب ایمان کو چارہ نہیں اسی طرح سنتِ نبوی کے اتباع کے بغیر بھی نجات نہیں مل سکتی، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کے دور سے لے کر آج تک کے تمام عرصہ میں اہل حق نے سنت کی اہمیت تسلیم کی ہے اور قرآن مجید نے ان ہی مومنین کاملین کی روش کو موجب نجات بتایا ہے اور جو اس سے روگردانی کرے وہ جہنم میں جھونکا جانے کا مستحق ہے (وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ (النساء: ۱۱۵)

---

[1] "الرسالہ" للامام الشافعی ص ۱۳ (الطبعۃ الاولیٰ سنہ ۱۳۲۱ھ بالمطبعۃ الکبری الامیریۃ، بولاق، مصر)

[2] اس مسئلہ پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی جلد چہارم میں بڑی عمدہ بحث کی ہے اس کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے، یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ خود سنت و حدیث میں بڑا فرق ہے جس کو ظاہر بیں حضرات نظر انداز کر دیتے ہیں۔ علمائے راسخین اور متقدمین نے اس کو ملحوظ رکھا ہے۔ (معارف)

اسی بنا پر احادیث و سنن رسول کی حفاظت و صیانت کا امت نے بڑا اہتمام کیا ہے جس کی بدولت اسماء الرجال کا بے نظیر اور عظیم الشان فن وجود میں آیا جس کے اندر ان لاکھوں افراد کے پورے حالات محفوظ کر دیئے گئے جن کا حدیث و سنت کی روایت سے کسی درجہ کا بھی تعلق تھا اور یہ وہ امتیاز ہے جو صرف امت محمدیہ کو ہی حاصل ہوا ہے اور کسی کو نہیں، جس کا اعتراف اسپرنگر وغیرہ بعض حقیقت پسند مستشرقین نے بھی کیا ہے[1]۔

احادیث کی حفاظت کس طرح ہوئی یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، اردو میں بھی متعدد کتابیں موجود ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی مشہور کتاب "تدوین حدیث" خصوصیت سے بڑی اہم ہے۔ ابتدا ہی سے حدیث کی حفاظت و صیانت پر امت کی بہترین صلاحیتیں صرف ہوتی رہی ہیں جس کا تسلسل آج تک برقرار ہے اور کوئی دور بھی حدیث کی حفاظت و صیانت کے اہتمام سے خالی نہیں رہا۔

---

[1] معارف۔ اس کے لئے خطبات مدراس اور سیرۃ النبی جلد اول کا مقدمہ ملاحظہ ہو۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلوی اور ان کا رسالہ

الدر المنضود فی حکم امرأۃ المفقود

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری استاذ شعبہ عربی گورنمنٹ ڈگری کالج بوائز سرینگر، کشمیر

صدر الصدور مفتی صدر الدین خاں آرزدہ دہلوی کشمیری (ولادت ۱۷۸۹ء / وفات ۱۶ / جولائی ۱۸۶۸ء) کے مشہور علمی رسائل میں "الدر المنضود فی حکم امرأۃ المفقود" کا ذکر ان کے جملہ تذکرہ نگاروں نے کیا ہے جن میں ان کے مخصوص احباب اور تلامذہ بھی شامل ہیں۔ عصرِ حاضر کے جن ارباب علم وتحقیق نے مفتی صاحب اور ان کی علمی وادبی خدمات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ان کو احقر کی معلومات کی حد تک آج تک یہ رسالہ دستیاب نہیں ہوسکا، ان ہی میں جناب عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی صاحب مرحوم بھی شامل ہیں جنہوں نے مفتی صاحب پر ایک مستقل کتاب مرتب کرکے شائع کی۔ زیر تعارف رسالہ کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ اب یہ ناپید ہے' (مفتی صدر الدین آزردہ ص

احقر اس اعتبار سے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہے کہ اسے ایک جلیل القدر عالم کے اس اہم علمی رسالے کا ایک مکمل نسخہ ریاستِ جموں وکشمیر کے محکمۂ تحقیقات ونشریات سے وابستہ شعبۂ مخطوطات عربی وفارسی میں ہاتھ آیا۔ اس کے کاتب سرینگر (کشمیر) کے رفیقی خاندان کے ایک عالم حافظ محمد یحییٰ بن شیخ حبیب اللہ رفیقی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے مؤلف کے ساتھ اپنے کسی نسبی تعلق یا شاگردی کا رشتہ رکھنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے مگر رسالہ کے صفحۂ اول پر ہی انہوں نے درج ذیل تعارفی سطور لکھ کر یہ جاننے کا موقع دیا ہے کہ وہ ان کے ہم عصر اور عقیدت مند تھے۔

باسمہٖ سبحانہ

الدر المنضود فی حکم امرأۃ المفقود للفاضل المحقق والنحریر المدقق الحاوی للفروع والأصول الجامع بین المعقول والمنقول، حجۃ الخلف بقیۃ السلف قدوۃ المحققین اکمل الکاملین صدر الملۃ والدین المفتی محمد صدر الدین دامت اظلال افاداتہ علی رؤس المستفیدین والمسترشدین۔

الدر المنضود اصل میں ایک استفسار ہے جس کا جواب مفتی صاحب نے مفصل دیا ہے۔ استفسار کرنے والے کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ انداز بیان کے لحاظ سے یہ فارسی رسالہ مفتی صاحب کے اس عربی استفسار کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے جو نامور محقق اور مصنف ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم کو دستیاب ہوا تھا اور جس کا عکس انہوں نے اپنے فاضلانہ پیش لفظ کے ساتھ اورینٹل کالج میگزین لاہور (بابت فروری ۱۹۴۹ء) میں شائع کیا۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس رسالے کا اصل موضوع ایک مشہور فقہی مسئلہ ہے جو فقہ کی کتابوں میں مفقود الخبر سے موسوم ہے۔ یعنی اگر کوئی شادی شدہ شخص لاپتہ ہوجائے، اس کے مقام ومسکن اور موت وزندگی کی کوئی اطلاع نہ ملتی ہو تو ایسے شخص کی بیوی کا کیا حکم ہے کیا وہ نکاح ثانی کرسکتی ہے؟ اس کو کتنی مدت تک اپنے شوہر کا انتظار کرنا ہوگا؟ خصوصاً جب کہ وہ جوان ہو اور زیادہ مدت تک انتظار کی صورت میں اس کی عفت وعصمت خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہو؟ اسی طرح مفقود الخبر کی میراث کا کیا حکم ہے؟ کیا اسے ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا یا آخری اطلاع ملنے تک باقی رہنے دیا جائے گا؟

اس مسئلہ کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ، صاحبین، امام شافعی (اپنی جدید یعنی آخری

تحقیق کے مطابق) امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے اکابر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جب تک مفقود کی موت کی یقینی اطلاع نہ ملے اس کی بیوی کو انتظار کرنا ہوگا اور اس کی وراثت امانت رکھی جائے گی۔ اس کے برعکس امام مالک صاحبؒ یہ رائے رکھتے ہیں کہ مفقود کی بیوی صرف چار سال تک انتظار کرے گی۔ اس کے بعد مفقود کو میت قرار دے کر اس کی بیوی موت کی عدّت ختم ہوتے ہی دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور اگر اس کے بعد پہلا شوہر آموجود ہوا تو وہ بیوی سے محروم ہو چکا ہوگا، اب وہ دوسرے شوہر کی بیوی ہوگی۔ اسی طرح امام مالک صاحبؒ کے نزدیک مفقود کی وراثت بھی چار سال کے بعد وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔

اگرچہ الدرالمنضود مذکور الصدر مباحث پر ہی مشتمل ہے تاہم ایک استفتا اور فتویٰ ہونے کی بنا پر اس کی نوعیت قدرے مختلف ہے۔ استفتا کا خلاصہ یہ ہے کہ کیا حنفی مذہب کے مقلّد عالم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ مفقود الخبر شخص کی بیوی کو امام مالک صاحبؒ کے مذہب کے مطابق چار سال انتظار کرانے کے بعد نکاح ثانی کی اجازت دینے کا فتویٰ دے (چاہے یہ عورت جوان ہو اور اس کے بدکاری کا مرتکب ہونے کا اندیشہ بھی ہو) حالانکہ اس حنفی عالم کو یہ علم ہے کہ اس میں اجلۂ فقہائے اسلام ایک طرف ہیں اور دوسری طرف تنہا امام مالکؒ ہیں۔ کیا علمی واقفیت کے باوجود اس طرح کا فتویٰ دینا کسی مفتی کے لئے جائز ہے؟

استفسار کی اصل عبارت یہ ہے:

سوال:۔ ماقولھم رحمھم اللہ دریں کہ شخصے مفقود است یعنی از موتِ او خبرے واز مسکنِ او اطلاعی نیست و زوجۂ او جوان است و خوف است کہ مرتکب حرامکاری وزنا شود۔ دریں صورت عالم مقلّدِ حنفی مذہب را باوجودِ ایں علم کہ زوجہ مفقود را تاانفصالِ مدّتی کہ برائے مفقود علی اختلافِ الاقوال نزدِ امام اعظم رحمہ اللہ و صاحبین او و امام شافعی بر قولِ جدید راجح و احمد بن حنبل معین و مقرر است نکاح باشخصے دیگر خلاف نیست، جائز است کہ فتویٰ جوازِ نکاح با دیگرے بر مذہب امام مالکؒ بعد گزشتن مدت چہار سال کہ مدت مفقود بنا بر مشہور نزد اوست و گزشتن عدت وفات بدہد۔ بیّنوا توجروا۔"

اس کے بعد مفتی صاحب جواب دیتے ہیں، جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

"عالم مقلد حنفی مذہب را فتویٰ دادن بر مذہب امام مالک دریں مقدّمہ جائز نیست وفتویٰ او بکار نمی آید ...."

اب سارے جواب کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ کتبِ فقہ اور فقہاء کی تحقیقات کی روشنی میں ایسے مقلد عالم کے لئے اس قسم کا فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ یہ فتویٰ اس اعتبار سے بھی بے معنی بن جاتا ہے کہ ایسے مسائل کے لئے قضائے قاضی ملحق ہونا ضروری ہے اور کسی مفتی کا خالص فتویٰ کافی نہیں ہوتا۔ اس طرح مسئلہ اپنی جگہ پھر باقی رہا۔ پھر اگر یہ بھی تسلیم کریں کہ عالم کا فتویٰ عامی کے حق میں قضائے قاضی ہی کا حکم رکھتا ہے مگر اس مسئلے میں حنفی مذہب پر عمل کرنے والے قاضی کا ایسا فیصلہ قابلِ نفاذ نہیں ہوتا ہے جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے:

القاضی المقلد اذا قضیٰ بخلاف مذھبہ لا ینفذ: یقضی (القاضی) بمذھبہ لا بمذھب المدعی أو مدّعی علیہ (فتوی البزازیۃ)	مقلد قاضی جب اپنے مذہب و مسلک کے خلاف فیصلہ دے تو وہ نافذ نہیں ہوتا۔ قاضی اپنے مسلک کے مطابق فیصلہ کرے گا، مدعی و مدعا علیہ کے مذہب کا لحاظ نہ کرے گا۔

اما القاضی المقلد فلیس	مقلد قاضی کو اپنے مذہب کے صحیح
لہ الحکم الا بالصحیح المفتیٰ	اور مفتیٰ بہ قول کے مطابق حکم دینا
بہ فی مذھبہ ولا ینفذ قضاؤہ	چاہئے اگر اس نے دوسرے کے قول
بقول الآخر (الرسائل الزینیۃ)	کے مطابق فیصلہ کیا تو وہ جاری نہ ہوگا۔

یہ نقول پیش کرنے کے بعد مفتی صاحب واضح کرتے ہیں کہ جن علماء نے اس کے جائز اور قابلِ نفاذ ہونے کا فتویٰ دیا ہے تو وہاں ان کی مراد قاضی مقلد کے بجائے قاضی مجتہد سے ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ ان علماء کا سہو ہے۔

البتہ اگر یہاں حنفی مذہب پر عمل کرنے والے کسی قاضی یا مفتی کو یہ علم نہ ہو کہ اس مسئلے میں اس کے امام کا مذہب مختلف ہے اور اسی لاعلمی میں اس نے امام مالک صاحبؒ کے مذہب کے مطابق فیصلہ یا فتوی دے دیا، تو وہ معذور ہے لیکن اگر دانستہ ایسا کیا تو وہ نافذ نہیں ہوگا۔ صاحبین کے نزدیک یہی مفتیٰ بہ ہے۔ گو خود امام اعظمؒ سے دو قول منقول ہیں تاہم فتوی صاحبین ہی کے قول پر ہے۔

رہی یہ بات کہ امام اعظمؒ، امام شافعی اور امام احمدؒ کے مطابق فتوی دینے کی صورت میں مفقود الخبر کی جوان بیوی کے بدکاری کا مرتکب ہونے کا اندیشہ ہے تو ایک فرضی اندیشہ کی بنیاد پر اکثر ائمہ مجتہدین کا ایک متفقہ فیصلہ نظر انداز کرنا، اجماع ٹھکرانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ جس مسئلے میں اکثر مجتہدین کی رائے اور تحقیق ایک ہو اسے اجماع کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ "اتفاق اکثر مجتہدین بمنزلہ اجماع است۔"

اس جلد بازی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایسے حکم کے نفاذ سے بہت سی برائیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بالخصوص ان ہزاروں غریب مسافروں کی زندگیاں تباہ ہو سکتی ہیں جو تلاشِ معاش میں دور دراز

کا سفر کرتے ہیں اور خط و کتابت کے اہل بھی نہیں ہوتے۔ ان کی بیویاں اس فتویٰ کی بنیاد پر چار سال انتظار کر کے فوراً نئے شوہر کی تلاش میں لگیں گی۔ پھر اگر اس کے فوراً بعد ان کا پہلا شوہر آگیا تو وہ بیوی سے محروم رہے گا کیونکہ امام مالکؒ ہی کی رائے کے مطابق اب یہ عورت دوسرے شوہر کی بیوی ہوگی۔ رسالہ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

"علاوہ آں ایں حکم مؤدّی مفاسد کثیر است و مستلزم خانہ ویرانی ہزارہا غربائے بیچارہ کہ درسفر بتلاش معاش بفاصلہ دور دراز رفتہ اند وخط وکتابت از انہا نمی رسد زوجہائے ایشاں بدست آویز ایں فتوی باظہار مفقودیتِ شوہرانِ مسافرین با شوہر جدید بعد مضی مدت چہار سال کہ مدتے است پس قلیل عقد مناکحت خواہند بست واگر درمیاں عرصہ شوہر اوّل مراجعت خواہد کرد بر مذہب امام مالکؒ زوجہ اش مدخولہ بہا باو نخواہد رسید۔ مالکِ آں شوہر ثانی خواہد بود۔"

مفتی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ اگرچہ قہستانی نے شرح مختصر وقایہ میں لکھا ہے کہ بحالتِ ضرورت امام مالکؒ کی رائے کے مطابق فیصلہ دینے میں کوئی قباحت نہیں ہے مگر مذکورہ بالا قباحتوں کو مدنظر رکھ کر قہستانی کا دعویٰ ناقابلِ قبول ثابت ہوتا ہے اور اسی وجہ سے قہستانی کی اس رائے پر الدر المنتقیٰ اور النہر الفائق میں اعتراض کیا گیا ہے۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں امام مالک صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ مفقود الخبر کی وراثت چار سال کے بعد اس کے وارثوں میں تقسیم کی جائے گی یہ بات بھی جمہور کے قول سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی ہے اسلئے اس قسم کا حکم نافذ کرنے والے قاضی کی یہ بھی غلطی ہوگی۔

"حکم بہ تقسیم مال او در ورثہ او بعد چہار سال نافذ کند، آنگاہ خلافِ مذہب خود و خلافِ مذاہب اکثر ائمہ مجتہدین بلا ضرورت کردہ باشد، زیرا کہ تقسیم مال مفقود درمیان ورثہ او

"بد مضی مدت چہار از عہد صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین تا الی الآن منقول و ماثور نیست۔"

امام مالک صاحبؒ کی اس رائے کے برخلاف دوسرے مذاہبِ فقہ کے اجلۂ علماء، خلفائے وقت اور قاضیانِ مملکت کا یہ عمل رہا ہے کہ مفقود کی وراثت ایک معین مدت تک امانت رکھی جاتی ہے اور بلاد و امصار کے سربراہوں اور متعلقہ اہل مناصب کو اس پر عمل کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ فقہ و فرائض کی متون و شروح کی کتابوں میں یہی تحقیق درج ہے۔ اب اگر اس مسئلے میں امام مالکؒ کی رائے پر عمل کیا جائے گا تو اس کا معنی یہ ہوا کہ اگر مفقود چار سال کے بعد لوٹا تو نہ صرف اپنی بیوی سے ہاتھ دھو چکا ہوگا بلکہ اپنی پونجی سے بھی محروم ہوگا۔

مفتی صاحب تلفیق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اب اگر یہ صورت نکالنے کی کوشش کی جائے گی کہ مفقود الخبر کی جواں بیوی کو امام مالکؒ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے چار سال کے بعد دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دی جائے گی مگر اس کی وراثت کو امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے ائمہ و فقہا کی رائے کے موافق بطور امانت محفوظ رکھا جائے گا، تو مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تلفیق باطل ہے۔ جس کے ثبوت میں انھوں نے بعض فقہا کی رائیں پیش کی ہیں جن میں امام طحاوی اور ملا حسن شرنبلالی بھی شامل ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگرچہ بعض علماء نے علامہ ابن ہمامؒ کی طرف تلفیق کا جائز ہونا منسوب کیا ہے جن میں طحطاوی بھی شامل ہیں مگر یہ انتساب درست نہیں ہے جو علامہ طحطاوی کی عدم تحقیق کا نتیجہ ہے۔ مولانا عبد العلی نے شرح تحریر میں، جو ان کی آخری تصنیف ہے، براہین محکمہ کی روشنی میں تلفیق کا باطل ہونا ثابت کیا ہے۔

مفتی صاحب قدرے ناگواری کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی تسلیم کریں کہ تلفیق جائز ہے، اس کے بطلان پر جو اجماع منقول ہے وہ باطل ہے اور ابن ہمام کی طرف

جواز کا انتساب بھی صحیح ہے مگر اس کے باوجود زیر بحث مسئلے میں اس پر عمل نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ تلفیق کی صورت صرف وہاں ممکن ہے جہاں دو امور کا اجتماع ممکن ہو۔ زیر بحث مسئلے کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہاں مفقود الخبر کو اپنی ذات کے لحاظ سے زندہ اور دوسرے کے حق میں مردہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اس کی بیوی کے دوسرے نکاح کے لئے جواز کا راستہ ڈھونڈ نکالنے کے لئے اسے مردہ قرار دیا جاتا ہے اور اس راہ میں امام مالکؒ کی رائے پر عمل کیا جاتا ہے مگر اس کی وراثت کو دوسرے ائمہ و فقہا کی تحقیق پر عمل کر کے امانت رکھا جاتا ہے تو یہ اجتماعِ نقیضین ہوا۔ یہی اس مسئلے میں بھی تلفیق کی پناہ لینے میں ساری راہیں مسدود کرتا ہے۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہ لکھتے ہیں کہ جو بھی کوئی شخص مسلکی تعصب سے خالی ہو وہ امام مالک صاحب کی مذکورہ رائے کے حق میں ایک بھی مضبوط دلیل نہ پائے گا۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے جیسا کہ بعض کتابوں میں منقول بھی ہے، کہ خود امام مالکؒ ہی مفقود الخبر کی بیوی اور وراثت سے متعلق دو مختلف مدتوں کے قائل تھے یعنی بیوی کو صرف چار سال کے بعد نکاح ثانی کرنے اور وراثت کو ساٹھ یا ستر سال تک باقی رکھنے کے قائل تھے تو اس تفریق کے حق میں نہ قرآن و سنت ساتھ دیتا ہے اور نہ اجماعِ صحابہؓ۔

"بر فطن لبیب منصف صاحب بصیرہ، در فقہ خالی از تعصب و عناد، سالکِ طریقِ انصاف امرا از اعوجاج و اعتساف پوشیدہ نباشد کہ ایں تفریق کہ امام مالکؒ بآں قائل شدہ اند و لیکن آں نہ کتاب است و نہ حدیث مرفوع و نہ اجماعِ صحابہ۔"

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کی تحقیق صرف حضرت عمرؓ کے ایک فیصلہ پر قائم ہے یا امام صاحب نے ایلاء پر قیاس کر کے یہ مدت متعین کی ہے۔ اپنے دعویٰ کی تائید میں مفتی صاحب نے فقہِ مالکی کی معتمد متون و شروح کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے اور نقول پیش کئے ہیں۔ ان

میں شرحِ رسالہ ابن زید، شرحِ مختصر خلیل، ترتیب المسالک شرحِ مؤطا امام مالک وغیرہ شامل ہیں۔ مگر مفتی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کا بھی یہ قول موجود ہے کہ مفقود کی بیوی کو موت یا طلاق تک انتظار کرنا ہوگا۔" وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ اس روایت کا ماخذ مصنف عبد الرزاق ہے مگر اس کی تائید امام طحاویؒ نے بھی کی ہے۔ انھوں نے اسے متعدد طرق سے شرح جامع کبیر اور شرح جامع صغیر میں ثابت کیا ہے بلکہ حضرت علیؓ نے اپنے مذکورہ بالا قول کے مطابق فیصلہ بھی دیا ہے جس کی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے موافقت کی تھی۔ اسی طرح دار قطنی میں بھی اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث موجود ہے۔ گو محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے مگر زیر بحث مسئلے میں اس کے ضعف سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کیونکہ یہاں ایک ثابت شدہ مسئلے کی ترجیح مقصود ہے نہ یہ کہ سرے سے اس کی بنیاد پر کوئی مسئلہ ثابت کرنا ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے جن بہت سے مسائل میں اپنی رائے سے رجوع کر کے حضرت علیؓ سے موافقت فرمائی تھی ان میں زیر بحث مسئلہ بھی ایک ہے جیسا کہ ابن ابی لیلیٰ کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے۔

مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ بخاری کی بعض شرحوں میں عبد الرزاق سے یہ روایت بھی ملتی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کی رائے بھی اس مسئلے میں حضرت عمرؓ کی اس رائے کے مطابق تھی جسے امام مالکؒ نے اختیار کیا، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ قطع نظر اس سے کہ عبد الرزاق کو اکابر نے تشیع سے متہم کیا۔ ' یا بستان المحدثین میں لکھا ہے کہ وہ غالی شیعہ نہیں تھے یا جیسا کہ میں نے اپنے اساتذۂ حدیث سے سنا ہے کہ اس زمانے میں جو شخص حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ کے فضل و بزرگی کا قائل ہوتا تھا، اسلاف اسے بھی شیعیت سے متہم کرتے تھے، ان سارے حقائق کے باوجود حق یہ ہے کہ حضرت

عمرؓ سے حضرت عثمانؓ کی موافقت کا انکشاف اولاً حاکم نے مستدرک میں کیا ہے۔ مگر فقہ و حدیث کے ماہر علماء جانتے ہیں کہ اگرچہ ان دونوں علوم میں صدہا کتابیں موجود ہیں تاہم ان میں معتبر اور قابلِ اعتماد وہی ہیں جن کے معتبر اور مستند ہونے کی فقہاء و محدثین نے شہادت دی ہے۔ جہاں تک مستدرک حاکم کا تعلق ہے تو اجلّہ علماء نے اس کتاب کا تخطیہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ علامہ ذہبیؒ نے صریح الفاظ میں لکھا ہے کہ کسی کو اس کتاب سے دھوکہ میں نہ پڑنا چاہئے۔ اس کا مطالعہ کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ پہلے ہمارے تعقبات۔ اور ملحقات دیکھ لیں اسی طرح علمائے حدیث نے بھی واضح کیا ہے کہ ذہبی کی تلخیص دیکھے بغیر مستدرک پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ انہی علامہ شمس الدین ذہبیؒ کی تحقیق ہے کہ اس کتاب کی بہت سی احادیث صحت کی شرط پر پوری نہیں اترتیں اور ان میں موضوع حدیثیں بھی موجود ہیں۔ خطیب نے حاکم کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ گو ثقہ ہیں مگر شیعیت کی طرف میلان رکھتے تھے۔ یہی حال طبرانی کی معجم اوسط کا ہے۔ فردوس دیلمی کی طرح اس میں بھی بہت سی منکرات کو جگہ دی گئی ہے۔ تحقیق پسند محدثین نے اعتراف کیا ہے کہ وہ بھی صحیح اور سقیم احادیث میں تمیز نہیں کرتے۔ اس قسم کی خامیاں بعض فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں بھی موجود ہیں مگر چاہے حدیث ہو یا فقہ جہاں کہیں بھی اس قسم کی روایات موجود ہوں وہ قابل اعتبار نہیں ہیں حقیقت یہ ہے، جیسا کہ اکثر محدثین اور فقہاء نے لکھا ہے کہ اس مسئلے میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے مابین اختلاف تھا اور دونوں نے اپنی اپنی رائے پر عمل کیا، مگر دوسرے فقہائے صحابہ کی طرف اس اختلاف کو منسوب کرنا خطا ہے۔

مفتی صاحب کی بحث کا آخری نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض نازک ترین مسائل حل کرنے کی غرض سے احناف اور شوافع دونوں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ایک قاضی جو بذاتِ خود کسی خاص فقہی مذہب کا مقلد ہو، دوسرے فقہی مذہب کے مقلد عالم یا مفتی کو اپنا نائب مقرر کر کے

اسے اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ یا فتویٰ دینے کی اجازت دے سکتا ہے اور جسے بعض علمائے احناف نے بھی بحالت مجبوری مستحسن سمجھا ہے مگر مفتی صاحب پورے اعتماد کے ساتھ فرماتے ہیں کہ زیر بحث مسئلے میں اولاً کسی مفتی کا خالص فتویٰ ہی بیکار ہے کیونکہ زن وشوہر کے درمیان صرف قاضی تفریق کرنے کا مجاز ہے نہ کہ مفتی۔ پھر قاضی بھی صرف اسی وقت ایسے نازک حالات میں طلاق کا فیصلہ دے سکتا ہے جب شوہر اور بیوی دونوں موجود ہوں۔ شوہر کی غیر موجودگی میں قاضی کو بھی طلاق دلانے کی اجازت حاصل نہیں ہے۔ اس طرح بہر صورت اس مسئلہ میں وہی رائے صحیح ہے جسے اجلۂ علمائے فقہ نے اختیار کیا ہے جن میں حضرت امام ابوحنیفہ رح پیش پیش ہیں۔ رسالے کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"وبالجملہ صورتِ جوازِ نکاحِ زوجۂ مفقود در غیبتِ او بعد انقضائے مدت چہار سال ہیچ گونہ معقول ومقبول نمودہ شود نہ درایۃً ونہ روایۃً۔ فالقول قول امامنا امام الائمۃ سراج الامۃ ابوحنیفۃ النعمان۔ افاض اللہ علیہ شآبیب الغفران واسکنہ فرادیس الجنان۔"

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ رسالہ بقامت اگرچہ کہتر ہے مگر معلومات کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر ہے۔ اس کی قدر وقیمت تسلیم کرنے کے لئے اگرچہ مفتی صاحب کا نام ہی سند کا درجہ رکھتا ہے تاہم کچھ اندازہ ان مآخذ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جن کے حوالے اس سات ورقی علمی رسالے میں ملتے ہیں اور جن کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔ ذیل میں چند کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ الرسالۃ الزینیۃ۔ فتاویٰ بزازیۃ۔ البحر الرائق۔ المغنی۔ برجندی شرح الیاس۔ شرح مختصر الوقایۃ (قہستانی)۔ رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ۔ النہر الفائق۔ المتفق والمختلف۔ الدر المنتقی۔ تحقیق فی ابطال التلفیق۔ شرح تحریر شرح مختصر

خلیل۔ شرح رسالہ ابن زید۔ ترتیب المسالک شرح موطا امام مالک۔ فتویٰ العمادیۃ۔ الحاوی۔ موطا امام مالک۔ فتح القدیر۔ النہایۃ (شرح ہدایہ) العنایۃ (شرح الہدایہ) الحاوی۔ موطا امام مالک۔ الدار القطنی۔ شرح جامع کبیر۔ شرح جامع صغیر۔ مصنف عبد الرزاق۔ بستان المحدثین۔ مستدرک حاکم۔ تاریخ بغداد۔ المعجم الاوسط۔ ذخیرۃ الصالحین۔ سراج الفقہ۔ القنیۃ۔

اس رسالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جن سرکردہ رفقائے درس نے اصلاح کے نام پر عدم تقلید کی جو تحریک شروع کی تھی اس کا انہوں نے کتنا اثر قبول کیا تھا! بلکہ اسی رسالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تقلید کی اہمیت پر بھی ایک مفصل رسالہ قلمبند کیا تھا فرماتے ہیں:۔

"..... در رسالہ وجوب تقلید شرح وبسط تمام نوشتہ ایم۔"

کاتب نے رسالہ کے اختتام پر لکھا ہے کہ وہ اس کی کتابت سے ۶ ر ماہ ذوالحجہ ۱۲۸۰ھ بروز جمعہ بوقتِ ظہر فارغ ہوئے۔ گویا اس کی تحریر کے وقت مفتی صاحب ابھی بقید حیات ہی تھے بلکہ اس کے بعد چار سال سے کچھ اوپر مدت تک زندہ رہے کیونکہ ان کی تاریخ وفات (۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء) میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اس سے موجودہ نسخے کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

باب التقریظ والانتقاد

عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت

از
مولوی محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دار المصنفین

مرتبہ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۹۷، مجلد مع گرد پوش،
قیمت ایک سو پچاس روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بیچ بلڈنگ، نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی شعبہ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے سیر و مغازی اور تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کے واقعات کا مطالعہ دقتِ نظر سے کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کا طویل و عریض مقالہ پہلے نقوش لاہور کے رسولؐ نمبر جلد پنجم و دوازدہم میں شائع ہو چکا ہے۔ اب اس کو انہوں نے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس میں اسلامی ریاست کی ابتدا اور ارتقاء کا ذکر کرکے اس کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کی بنیادیں خدا کی حاکمیت اعلیٰ، پیغمبر خدا کی نیابتِ خداوندی، امت مسلمہ کی اخوت و مساوات اور احترام و محبت بنی آدم کے عظیم اصولوں اور عملی نمونوں پر قائم تھیں۔ اپنی ان بنیادی خصوصیات کی وجہ سے یہ اسلامی ریاست تمام دنیاوی حکومتوں اور ریاستوں سے علانیہ ممتاز تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب بڑی کد و کاوش سے لکھی گئی ہے اور اپنے موضوع پر مفید اور معلوماتی ہے لیکن بعض امور مزید بحث و تنقیح کے محتاج ہیں۔ ذیل میں انہی کی جانب توجہ دلانا مقصود ہے۔

مصنف کے خیال میں ہجرت کے لئے مدینہ کا انتخاب سیاسی، سماجی، اقتصادی، فوجی ہر اعتبار سے مناسب تھا اور یہ خالص ٹھوس تاریخی عوامل ہی ہجرت کا باعث بنے تھے گو وہ اسے بھی تسلیم کرتے

ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر کام منشائے الٰہی کے مطابق کرتے تھے، مگر ان کے خیال میں قدیم مؤرخین اور سیرت نگار یا محدثین و مفسرین کرام اپنے عہد کے تاریخی شعور کے نتیجہ میں ان تاریخی عوامل و اسباب کو نظر انداز کرکے صرف مسئلہ کی مذہبی توجیہ و تعلیل کے درپے رہے ہیں۔

مصنف کو اس سلسلہ میں جو اشتباہ ہوا اس کے ازالہ کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا۔

"مدینہ میں اسلام کی کامیابی کا سبب، یہ ایک ایسا تاریخی سوال ہے جس کی نسبت یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی سے پہلے تاریخ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ وہ اس قسم کے سوالات پیدا بھی کر سکے۔ آج کل بڑے بڑے مصنفین اور اربابِ قلم جب ان عقدوں کو حل کرتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ آسمان کے تارے توڑ رہے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اس کی نگاہ میں یہ نکتہ پوشیدہ نہ تھا۔ مخالفتوں کے ہجوم میں اسلام کی ترقی قدرتِ الٰہی کا ایک معجزہ ہے۔ لیکن ضرور نہیں کہ معجزہ اسباب عادی کے بغیر ہی ظہور پذیر ہو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے فضل سے کسی شے کے ہونے کے مختلف اسباب کو ایک وقت مناسب میں مہیا اور مجتمع کر دینا بھی تو معجزہ ہے جو دنیا میں ہر کام کو میسر نہیں آتا۔ ورنہ اس عالم امکان میں کوئی تحریک کبھی ناکامیاب نہ ہوتی۔ حالانکہ ہزاروں تحریکیں ہیں جو عدم اسباب کی بنا پر سرسبز نہیں ہوتیں۔" (سیرت عائشہؓ ص ۲۳۰۔ ۲۳۱)

آگے چل کر سید صاحب نے اس بنیادی سبب کو بیان فرمایا ہے جو مدینہ منورہ میں اسلام کی کامیابی کا حقیقی باعث بنا۔ فرماتے ہیں:

"اسلام کے ظہور سے پہلے مدینہ کے قبائل باہم خانہ جنگیوں میں مصروف تھے، ان

لڑائیوں میں ان قبائل کے اکثر ارباب و عمار قتل ہو گئے۔ اور یہی لوگ ہمیشہ ہر تحریک کے مانع ہوتے ہیں، اس سے ان کی پوزیشن کو صدمہ پہنچتا ہے۔ انصار ان لڑائیوں سے اس قدر چور ہو گئے کہ اسلام آیا تو سب نے اس کو رحمت سمجھا اور چونکہ ارباب و عمار کا طبقہ مفقود ہو چکا تھا اس لئے ان کی راہ میں کسی نے موانع پیدا نہیں کئے۔ اس طریقے سے خدائے پاک نے اسلام کی ترقی کے راستے مدینہ میں صاف کر دئے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

کان یوم بعاث یوما قدمہ اللہ لرسولہ صلی اللہ علیہ وسلم فقدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقد افترق ملؤھم وقتلت سرواتھم وجرحوا فقدمہ اللہ لرسولہ فی دخولھم الاسلام۔
(بخاری۔ باب القسامۃ فی الجاہلیۃ۔
(سیرت عائشہؓ ص ۲۳۱)

جنگ بعاث وہ واقعہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پہلے سے پیدا کر دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو ان کی جمعیت منتشر ہو گئی تھی، اور ان کے سردار مارے جا چکے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان کے اسلام میں داخل ہونے کے لئے یہ واقعہ پہلے ہی سے مہیا کر دیا تھا۔

مصنف نے تو نائیدہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں مواخاۃ کے دانشمندانہ اور حکیمانہ طریقۂ کار کی طرف متوجہ کر کے اس کے دور رس نتائج بیان کئے ہیں، لکھتے ہیں:

"مواخاۃ دراصل مسلم معاشرہ۔ امۃ۔ کی تشکیل کا دوسرا مرحلہ تھا، جس کا مقصد

ایک نووارد شہر کو ایک قدیم باشندے کے ساتھ رشتۂ اخوت و محبت میں منسلک کر دینا تھا تاکہ خارجی و اندرونی، ملکی و غیر ملکی، اپنے پرائے اور فرزندان زمین و تازہ واردان بساط اور سب سے بڑھ کر مکی اور مدنی کا فرق مٹ جائے۔ اور مدینہ کی مسلم آبادی ایک مذہبی وحدت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی اور معاشی وحدت بھی ہو جائے" (ص ۲۸)

پھر وہ اسی جذبۂ اخوت کے مفید ثمرات یوں بیان کرتے ہیں:

"یہی وہ اسلامی جذبۂ اخوت تھا جس نے مالدار مسلمانوں میں اپنے غلام دینی بھائیوں کو خرید کر آزاد کرانے کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ اسی نے مسلمانوں میں تعاون اور امداد کے ایک غیر معمولی احساس اور عمل کو تحریک دی تھی، اسی نے ان کو ایک امت سے وابستہ ہونے کا طاقتور شعور بخشا تھا اور یہی جذبہ ان کو بحرانوں اور مصائب و آلام کے زمانے میں نہ صرف زندہ اور متحرک و فعال رکھتا تھا بلکہ ان کے ملی شعور یگانگت و وابستگی کو اور مضبوط تر و پائیدار بناتا تھا۔" (ص ۳۰-۳۱)

مگر اسی کے ساتھ مصنف کو عام مسلمان مورخین کے اس نقطۂ نظر سے بھی اختلاف ہے کہ مواخاۃ اقتصادی مجبوری اور معاشی ضرورت کے تحت عمل میں لایا گیا تھا اور یہ ایک عارضی انتظام تھا گو اس کے نتائج دور رس تھے، ان کے خیال میں اس کا مقصد دو شہروں کے سماجی و قبائلی تعصبات کا خاتمہ کر کے دو مختلف سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی پس منظر کے طبقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا (ص ۲۹) حالانکہ مصنف کو خود یہ اعتراف بھی ہے کہ مواخاۃ ہی کا جذبہ مسلمانوں کو مصائب و آلام کے زمانے میں ان کو زندہ اور متحرک و فعال رکھتا تھا۔ اور اگر مصنف کا یہ مزعومہ قبول بھی کر لیا جائے تو اس رشتہ کی اہمیت و افادیت انصار و مہاجرین کے مابین کم جب کہ اوس اور خزرج کے درمیان زیادہ محسوس ہوتی ہے، کیونکہ یہ داعیہ ان میں اول روز

سے باقی رہا اور مختلف موقعوں پر ابھرتا رہا۔ چنانچہ ابن اسحاق کی ایک روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں آمد سے قبل اوس و خزرج کی امامت حضرت مصعبؓ بن عمیر کیا کرتے تھے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں قبیلوں کے لوگ اپنے حریف کو امام بنانا پسند نہیں کرتے تھے (ابن ہشام ج ۱ ص ۲۶۱) پھر غزوۂ تبوک اور واقعۂ افک میں بھی ان کی یہی عصبیت بھڑک اٹھی تھی، جس سے مدینہ کے اسلامی معاشرہ کو سخت اضطراب کا سامنا کرنا پڑا۔

مصنف نے اپنے اس دعوی کی تائید میں کہ مکہ میں دو مکی مسلمانوں کے درمیان مواخاۃ کا حوالہ بھی دیا ہے جس کا مقصد ان کے بقول مکّہ کے قبائلی تفرقوں کو مٹانا، نفرتوں کو ختم کرنا اور عصبیت کو نابود کرنا تھا (ص ۲۸ - ۲۹) گو انہوں نے اس واقعہ کا ماخذ نہیں تحریر کیا ہے مگر یہ دراصل خود ان ہی کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے، اس مواخاۃ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم زاد حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنایا تھا۔ جو ابتداء سے آپؐ کی کفالت میں تھے۔

اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ مہاجرین خالی ہاتھ مدینہ منورہ نہیں گئے تھے مگر اس کو نقلِ مکانی سے تعبیر کرکے مصنف نے نہ صرف ہجرت کا اصل مقصد گڈ مڈ کر دیا ہے بلکہ انصار کے عدیم المثال ایثار و قربانی پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔

مواخاۃ اصلاً ایک عارضی ہی انتظام تھا مگر خاندانی، نسلی یا قومی عصبیت پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ پھر یہ طریقہ عربوں کے لئے نامانوس نہ تھا بلکہ مفلس اور نادار بھائیوں کی مدد اور دستگیری کے اس طریقے کا ان میں عام رواج تھا چنانچہ ابو طالب کی غربت و تنگدستی کی وجہ سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اور حضرت عباسؓ بن عبد المطلب نے حضرت جعفرؓ کو اپنی کفالت میں لے لیا تھا۔ (طبری ج ۲ ص ۳۱۳) فرق صرف یہ تھا کہ پہلے اس طرح کی باتیں محض قومی جوش اور خاندانی عصبیت کی بنیاد پر ہوتی تھیں مگر اسلام نے

اس کی بنیاد عالمگیر اور دائمی اخوت پر رکھی۔

مصنف نے اسلامی ریاست کی تشکیل میں دستور (کتاب نبویؐ) کو بڑی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی تمام جزئیات پر مفصل بحث کرکے آنحضرتؐ کی سیادت و قیادت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے جس سے مستشرقین کے اس غلط خیال کی تردید بھی ہوگئی ہے کہ آپؐ محض ایک قبائلی سردار تھے۔ (ص ۴۲ - ۴۳)

اس موقع پر اگر وہ اس دستورِ نبویؐ کے اجزاء کا تعین بھی کر دیتے تو اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

مصنف نے عہد نبویؐ کی ابتدائی مہموں پر بہت مفصل اور جامع گفتگو کی ہے، اور اس بارہ میں مستشرقین کی ایک ایک غلط بیانی کی مکمل تردید کی ہے۔ (ص ۴۴ - ۴۹) ان کے خیال میں ان کو فوجی مہم سمجھنا غلط ہے ان کی نوعیت سیاسی سفارت کی تھی چنانچہ ان کے دوران میں قرب و جوار کے علاقوں سے تعلقات بھی قائم ہوئے۔ (ص ۴۵) مگر اس بارہ میں مصنف کا یہ دعوی محلِ نظر ہے کہ یہی ان ابتدائی مہموں کا اولین و آخرین مقصد تھا۔ (ص ۵۰) کیوں کہ اسے تسلیم کر لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مہموں میں عموماً مہاجرین ہی کیوں روانہ کئے گئے جن کو باقاعدہ علم (لوا) دیکر روانہ کیا جاتا تھا۔ جب کہ جن قبائل سے معاہدۂ امن و امان کیا جاتا تھا وہ خود مصنف کی تحقیق کے مطابق انصار کے حلیف رہ چکے تھے لیکن اس کے باوجود تقریباً ہر مہم میں قریش کے کسی نہ کسی قافلہ اور کارواں کا آمنا سامنا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ بالفرض اگر ان کا مقصد محض معاہدۂ امن ہی تھا تو اس کے لئے معہود سفارتی طریقۂ کار کو کیوں نہیں اختیار کیا گیا جس طرح متعدد امراء و ملوک کے نام نامہ ہائے مبارک روانہ کئے گئے تھے۔

دراصل ان مہموں کا مقصد سفارتی مشن بھی تھا اور فوجی مشق بھی۔ اور اس کے ذریعہ اسلام

کے دشمنوں قریش کو یہ بتلانا مقصود تھا کہ اگر انہوں نے مرکزِ اسلام (مدینہ منورہ) کو بری نظر سے دیکھا تو ان کے تجارتی قافلے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اور غالباً ان مہموں میں مقامات کا انتخاب بھی ایسے ہی مواقع پر کیا جاتا تھا جب کہ وہاں سے تجارتی قافلوں کا گزر ہو رہا ہوتا تھا تاکہ بیک وقت دونوں مقاصد حاصل ہو سکیں۔ ہمیں اس بارہ میں مصنف کے اس خیال سے مکمل اتفاق ہے کہ ان مہموں میں دشمن سے کسی قسم کی نبرد آزمائی مقصود نہ تھی۔ (ص ۵۴) بلکہ صرف ان کے لئے اس بات کا مظاہرہ تھا کہ وہ ان کے تجارتی قافلوں کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس بارہ میں علامہ شبلی کا نقطۂ نظر نہایت صائب اور تاریخی حقائق پر مبنی ہے وہ لکھتے ہیں:

"بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی کیوں کہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے تمام قبائل متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی۔ اس بنا پر آپؐ نے دو تدبیریں اختیار کیں اول یہ کہ شامی تجارت جو ان کا مایۂ غرور تھی بند کر دی جائے تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں.... دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے جو قبائل ہیں ان سے امن و امان کا معاہدہ ہو جائے۔ (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۱۰)

علامہ شبلیؒ نے ان مہموں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے بعض معاہدۂ امن کے متون بھی نقل کئے ہیں (ایضاً ص ۳۱۰-۳۱۴) مگر معلوم نہیں کیوں مصنف نے صرف اول الذکر ہی کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ (ص ۴۴ و ۵۶۱ حاشیہ ۹۳) اور معاہدۂ امن و امان کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امر کے بارے میں مصنف کے بیان میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ بڑے شد و مد سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ مہیں محض سفارتی مشن تھیں لیکن دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"اس مہم (نخلہ کی مہم) کا محرک و مقصد غارتگری، مال کی حرص اور روز افزوں امت کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرنا نہ تھا جیسا کہ مغربی مؤرخین نے دعویٰ کیا ہے بلکہ اس کا محرک و مقصد سیاسی اور دفاعی تھا۔ (ص ۴۲)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں۔

"واقدی اور ان کے دو تین متبعین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو خرار اس لئے بھیجا تھا کہ وہاں سے ایک قریشی کارواں گزرنے والا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب کیوں کر لیا جائے کہ اس سے مراد چھاپہ مارنا تھا۔ اس کا مقصد ان کے بارے میں خبریں فراہم کرنا بھی تو ہو سکتا ہے" (ص ۴۷)

انہیں اس اہم حقیقت کا بھی اعتراف ہے کہ قریش مسلمانوں سے عداوت مول لے کر اقتصادی طور سے زندہ نہ رہ سکتے تھے (ص ۴۵-۵۱) اس طرح مصنف نے باوجودیکہ کہیں کہیں علامہ شبلی سے اختلاف کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے اکثر بیانات ان ہی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔

کتاب میں عظیم جد و جہد کے عنوان سے غزوۂ بدر سے لے کر غزوۂ خندق تک کا بہت اجمالی تذکرہ ہے (ص ۵۱-۵۴) یہ حصہ بہت تشنہ تحقیق ہے اس میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اس عظیم جد و جہد کے عوامل و اسباب کیا تھے؟ اور یہ کیسے اور کیونکر شروع ہوئی البتہ ان کا یہ تجزیہ درست ہے کہ غزوۂ خندق کے بعد قریش مکہ کی کمر ٹوٹ گئی تھی اور وہ دوبارہ اسلامی ریاست سے ٹکرانے کے اہل نہیں رہ گئے تھے۔

اندرونی مخالفت کے عنوان سے مدینہ منورہ میں آباد یہودی قبائل اور مار آستینِ منافقین کی خفیہ ریشہ دوانیوں اور علانیہ سازشوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس بارہ میں مستشرقین کے

بعض غلط اعتراضات کی تردید بھی دوسرے مصنفین کے حوالوں سے کی گئی ہے جو مفید ہے
منافقین کے بارہ میں ان کے بیان کا یہ تضاد ملاحظہ ہو پہلے تحریر کرتے ہیں کہ

"جوں جوں اسلام کو عروج، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی اور ریاست اسلامی کو توسیع واستحکام حاصل ہوتا جاتا تھا، توں توں منافقین کی آتش حسد بھڑکتی جاتی تھی اور وہ اسلام اور ریاست مدینہ کی بیخ کنی کی تدبیریں کرتے جاتے تھے۔" (ص ۵٦)

پھر وہ ان کے شنیع اعمال وحرکات کا جائزہ لینے کے بعد یہ حیرت انگیز تبصرہ کرتے ہیں

"تاہم یہ تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ماخذ اور ہمارے جدید مؤرخین دونوں نے منافقین اور خاص کر عبداللہ بن ابی کی طاقت وقوت اور منافقت کا مبالغہ آمیز بیان اختیار کیا ہے۔" (ص ۵٧۲ حاشیہ نمبر ۱٦۲)

مصنف کے خیال میں اسلام سے قبائل عرب کی عداوت کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پھیلنے کی صورت میں انھیں اپنی امن دشمن حرکات جاری رکھنے کا موقع نہ ملتا (ص ۵٧ اسی لیے وہ مسلسل مدینہ منورہ کے خلاف اقدامات کرتے یا منصوبہ بناتے رہتے تھے مگر ہمارے خیال میں ان کی دشمنی کی وجہ شرک وبت پرستی بھی تھی، جس پر اسلام قدغن لگاتا تھا اور قریش مکہ اس کو مزید ہوا دیتے تھے جن کو اس عہد میں مذہبی سربراہی حاصل تھی۔

مصنف کو علامہ شبلیؒ کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ بدر کی فتح مبین کے بعد قبائل عرب پر ہیبت طاری ہوگئی تھی، اور وہ اسلام دشمنی سے باز آگئے تھے مگر احد کے بعد پھر ان کے حوصلے بلند ہوگئے حالانکہ ان کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ بدر اور احد کے درمیان جو مہمیں روانہ کی گئیں وہ دراصل فوجی مہمیں نہ تھیں بلکہ سیاسی اور

مذہبی دورے تھے (ص ۵۸) جبکہ اس کے برخلاف بنو ثعلبہ، قبیلہ اسد، بنولحیان اور بنو مصطلق وغیرہ مختلف قبائل کی سرکوبی کے لیے جو اسلامی مہمیں روانہ کی گئیں وہ خود مصنف کی تحقیق کے مطابق غزوۂ احد کے بعد ہی بھیجی گئی تھیں۔

صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھے جانے کے وقت حضرت علیؓ کے جذبۂ ایمانی کا تذکرہ علامہ شبلیؒ نے بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ (سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۵۵) مصنف اس پر یوں طعنہ زن ہیں:

"ابن اسحاق نے حضرت علیؓ کے اس فقرہ کا حوالہ نہیں دیا ہے جس کے مطابق انھوں نے اپنے ہاتھ سے محمد رسول اللہ ﷺ کو مٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ شبلی نے (سیرۃ النبی ج اول ص ۴۵۵) اس واقعہ کو بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء، نیز مسلم الفاظ کی بنیاد پر بڑے طمطراق سے نقل کیا ہے۔" (ص ۵۸٦ - ۵۸٧ حاشیہ نمبر ۲۵٦)

پتہ نہیں مصنف کی اس طعنہ زنی کا نشانہ بخاری ومسلم کی روایتیں ہیں یا علامہ شبلیؒ کا اسلوب نگارش جس کا زمانہ معترف ہے۔ صحیحین کے مقابلہ میں ابن اسحاق کو اس قدر طمطراق سے پیش کرنا کیا خود مضحکہ خیز نہیں ہے۔

بیعت رضوان کے سلسلہ میں ابن ہشام کے حوالہ سے یہ لکھنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت لی تھی (ص ۵۸٦ حاشیہ نمبر ۲۵۲) ایک دلچسپ تاریخی غلطی ہے جس کے شکار بہت سے لوگ ہوئے ہیں عقلی طور پر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ جس شخص کے خون بہا کے لیے بیعت لی جارہی ہو خود اس کی طرف سے کیسے بیعت لی جا سکتی ہے ہماری ناقص رائے میں اس عبارت کا مفہوم یہ ہے

کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ سے حضرت عثمانؓ کے قصاص کے لیے بیعت کی ابن ہشام کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بایع لعثمان فضرب باحدی یدیہ علی الاخری۔

(ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۱۵)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کے لیے خود اپنے آپ سے بیعت کی اور اس کے لیے آپؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھا۔

مذکورہ بالا عبارت میں لعثمان (حضرت عثمان کے لیے) آیا ہے اگر حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت مقصود ہوتی تو لعثمان کے بجائے من عثمان ہوتا، اس خیال کی تائید جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

عن انس بن مالک قال لما امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببیعۃ الرضوان کان عثمان بن عفان رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی اہل مکۃ قال فبایع الناس فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان عثمان فی حاجۃ اللہ وحاجۃ رسولہ فضرب باحدی یدیہ

علی الاخری، فکانت ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان خیرا من ایدیہم لانفسہم

(ترمذی، باب مناقب عثمان بن عفانؓ)

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان کا حکم دیا تو اسوقت حضرت عثمانؓ آپکے قاصد بنکر مکہ والوں کے پاس گئے تھے، راوی کہتے ہیں کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عثمانؓ اللہ اور اس کے رسول کی حاجت میں ہے، یہ فرماکر اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا تو حضرت عثمانؓ کے لیے رسول اللہ کا مبارک ہاتھ لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے اچھا تھا۔

اس روایت سے جہاں بیعت رضوان کا پس منظر سامنے آتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ عام صحابہ کرام کے ساتھ ہی آپؐ نے بھی اپنے دست مبارک سے بیعت کی تھی۔

غزوہ موتہ پر عمدہ بحث کرکے مستشرق مونٹگمری واٹ کے گمراہ کن خیالات کی تردید میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اہم ہے مگر فتح مکہ کی تصویر جس انداز میں پیش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مکہ میں فاتحانہ تمکنت کے ساتھ داخل ہوئے حالانکہ قرآن مجید نے عاجزی و انکساری کے ساتھ داخل ہونے کی تاکید کی تھی مصنف لکھتے ہیں:۔

"دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی تیاری کی اور ایک لشکر جرار لے کر حملہ آور ہوئے، مکہ میں اتنا دم خم نہ تھا کہ وہ مقابلہ کرسکتا، اس کے علاوہ غالباً مکہ والوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا زیادہ مفید سمجھا، چنانچہ رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء میں اس مغرور وظالم شہر نے اس دریتیم کے سامنے سر جھکا دیا جس کو اس نے آٹھ سال قبل عالم بے سروسامانی میں جلاوطن کر دیا تھا۔" (ص ۷۱)

مصنف کو علامہ شبلیؒ کے اس نقطہ نظر سے اختلاف ہے کہ اسلام دشمنی میں قبائل کی خاندانی رقابت کو بھی دخل تھا، جن میں بنو امیہ پیش پیش تھے انکے خیال

میں بنو ہاشم اور بنو امیہ میں کوئی خاندانی رقابت نہ تھی، بلکہ جس نے بھی اسلام کی مخالفت کی تھی
اس نے خدا اور رسول کی دشمنی میں کی تھی۔ ہمارے خیال میں مصنف کا تجزیہ تو درست
اور صحیح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریشی افواج کی قیادت ابوسفیان بن حرب
نے قریش اور اہل مکہ کی فوجوں کے مقررہ قبائلی قائد کے طور پر کی تھی مگر ان کا یہ کہنا کہ ابولہب
بن عبدالمطلب اور عباس بن عبدالمطلب کو بھی اتنی ہی اسلام دشمنی اور عداوت رسول تھی
صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے تو علامہ شبلیؒ کے نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے کیونکہ حضرت عباس بن
عبدالمطلب اور عبدالمطلب کے دوسرے فرزند ہجرت کے پہلے ہی سے ابوطالب کی دعوت
پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی اور طرفدار تھے البتہ ابولہب ضرور اس زمرہ سے خارج تھا
جس کی مخالفت کی وجہ یہ بھی کہ وہ حرب کی بیٹی اور ابوسفیان کی بہن ام جمیل سے منسوب تھا،
یہ نسبت مصنف کے نزدیک بھی مسلم ہے غالباً قرآن مجید کی سورۂ لہب میں امرأۃ ابی لہب کا ذکر خصوصیت
اسی بنا پر آیا ہے اور مصنف بھی اس پر متفق ہیں کہ خاندان رسولؐ میں ابولہب بن عبدالمطلب
نے اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی۔

مصنف نے سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۱۰ کے حوالہ سے جو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے
کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو پہلے پہل بنو عبدالمطلب بن ہاشم نے اس طرح ٹھکرا
دیا تھا جس طرح کہ صفا پر آپؐ کے اعلان حق کو دوسرے قبائل قریش نے (ص ۹۱) حالانکہ
یہاں بنو عبدالمطلب میں صرف ابولہب ہی کا ذکر ہے، اسی طرح مصنف کا یہ تجزیہ بھی
درست نہیں کہ خاندان کی محبت میں کسی ہاشمی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا (ص ۹۲۔
۹۳) کیونکہ حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کا واقعہ اس کی روشن مثال ہے البتہ یہ امر
واقعہ کے عین مطابق ہے کہ ایک ہاشمی فرد کی حیثیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

تحفظ
ابوطالب اور ان کے خاندان والوں کی حمایت وحفاظت دراصل عربوں کے قبائلی نظام
کا اظہار تھا۔ (ایضاً ص ۹۳-)

قبائل عرب اور اسلام کے عنوان سے قبائل کی اسلام میں شمولیت کا جائزہ
اس قدر طویل ہے کہ کتاب کا اصل موضوع ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور یہ
معلوم ہوتا ہے کہ یہ انساب کی کوئی کتاب ہے تاہم یہ مباحث فائدہ سے خالی نہیں ہیں
انھوں نے اس باب میں نہایت شدومد سے اس کی تردید کی ہے کہ اسلام کے
ابتدائی عہد کے مسلمان سماجی طور پر کمزور اور پس ماندہ تھے، اور اپنے اسی دعوے
کے ثبوت کے لیے انھوں نے جو طویل تجزیہ پیش کیا ہے اس کے فوائد بیان کرتے
ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے ایک طرف تو یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ مکہ میں اسلام کی اشاعت
قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھی اور اس میں قبائلی خاندانی رقابت وعصبیت
کو دخل نہیں تھا، اور دوسری طرف قریش کے ہر بطن (خاندان) کا اسلام
اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رویہ وسلوک بھی نمایاں ہوگا، یہ ایک
بیّن سماجی حقیقت ہے کہ افراد کا اپنے اپنے خاندانوں میں خاص کر اور اپنے
علاقے کے سماج میں عام طور سے ایک مقام اور اثر ہوتا ہے، اور سربرآوردہ
اور اہم افراد ہی عموماً کسی سماجی اور تہذیبی تحریک کی داغ بیل ڈالتے
ہیں اور اس کو پروان چڑھاتے ہیں، اس لیے بھی یہ تجزیہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔"
(ص ۸۸-۸۹)

مصنف کے خیال میں ابن اسحاق نے ضعفاء المسلمین (کمزور مسلمانوں) کے زمانہ

قبول اسلام کا کسی زمانے میں ذکر نہیں کیا ہے جن کے بارہ میں ان کے بقول عام شہرت یہ ہے کہ وہی اسلام کے اولین پیرو تھے، بلکہ اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مذہب کو پہلے ماننے والے ہمیشہ کمزور لوگ ہوتے رہیں۔ (ص ۸۲)

یہ اور اس طرح کی دوسری تحریریں مستشرقین سے مرعوبیت کا نتیجہ ہیں، ورنہ وہ خود بھی غیر شعوری طور پر اس سے متفق نہیں معلوم ہوتے ہیں اس کے ثبوت میں وہ اپنی کتاب کے صفحات ۷۷، ۸۸ کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

مصنف نے حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانیؒ پر بیجا حرف گیری کی ہے کہ انھوں نے ایک غلط فہمی یہ بھی عام کر دی ہے کہ ہجرت نبویؐ سے کچھ پہلے مکہ سے چند مسلمانوں کے سوا اور باقی سب مدینہ چلے گئے تھے۔ (ص ۸۷) دراصل علامہ شبلی نے ہجرت نبوی سے قبل اکثر صحابہ یا اکابر صحابہ کے مدینہ پہونچنے کا ذکر کیا ہے، اور مکہ میں رہ جانے والوں کی تفصیل انھوں نے بعد میں بیان کی ہے جس کا اعتراف مصنف کو بھی ہے

مصنف اس مشہور اور بدیہی حقیقت کے بھی منکر ہیں کہ ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد جب قریش مکہ کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو اسلام کی اشاعت میں بھی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی (ص ۸۶ و سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۵۰) مگر صلح حدیبیہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس نے خود بخود ان کے اس مزعومہ کی تردید ہو جاتی ہے ملاحظہ ہو ص ۸۸۔

کتاب کے مشمولات میں یکسانیت کی وجہ سے کہیں کہیں تضاد و تکرار بھی ہے مثلاً پہلے انھوں نے عہد نبویؐ کی ابتدائی مہموں کا اصل مقصد سفارتی مشن بتایا ہے مگر عہد نبوی کی فوجی تنظیم کے تحت اس کے برعکس وہ یہ لکھتے ہیں:

"عہد نبویؐ کی ابتدائی مہمیں دراصل اس عسکری تنظیم کا سنگ بنیاد تھیں"

(ص ۲۰۳)

یہاں پہونچ کر وہ پوری اسلامی فتوحات کا سہرا اسی عسکری تنظیم و تربیت کے سر باندھ دیتے ہیں ملاحظہ ہو ص ۲۰۳، اس طرح کی تحریروں سے مصنف کی شدت و انتہا پسندی کا اندازہ ہوتا ہے ورنہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فتوحات میں تائید و نصرت الٰہی کو زیادہ دخل رہا ہے حیرت ہے کہ مصنف ایک طرف تو عسکری تنظیم و تربیت ہی کو اسلامی فتوحات کی اصل وجہ قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اس کی غیر معمولی اہمیت کے منکر بھی ہیں ملاحظہ ہو ص (۲۲۱)

کتاب کے آخری تین ابواب مصنف کی خاص محنت و تحقیق کا نتیجہ ہیں مگر غزوہ احزاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو غطفان کو مدینہ منورہ کی ایک تہائی پیداوار دینے کی جو پیشکش کی تھی، اس کو صرف ایک حربی تدبیر قرار دینا جس کا مقصد قریش و یہود کی جمعیت میں پھوٹ ڈالنا تھا نامناسب ہے بلکہ یہ بات شان نبوت سے فروتر ہے، اسی طرح اذان کی مشروعیت کو محض ایک صحابی کے تجویز و مشورہ کا نتیجہ قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں رویائے صادقہ کی تائید بھی حاصل تھی۔

کتاب کے اخیر میں ضمیموں کی فہرست سے بھی اس کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے مگر کتابت و طباعت کی متعدد غلطیاں بھی ہیں اور ص ۹، ۱۰ اور ۱۱ کی ترتیب صحیح نہیں ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مصنف کی علمی کاوش اور بڑی ریاضت کا نتیجہ ہے، خصوصاً مستشرقین کی تردید میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ اہم ہے جس کے لیے مصنف ستایش کے مستحق ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

کتاب الردۃ و نبذۃ من فتوح العراق — از محمد بن عمر بن واقد واقدی، تہذیب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۸۶، قیمت تحریر نہیں۔

پتہ: الشرکۃ المتحدہ للتوزیع بیروت، شارع سوریا۔

محمد بن عمر بن واقد واقدی (م ۲۰۷ھ) صاحب کتاب التاریخ والمغازی والمبعث کی زیر نظر کتاب کا ایک ہی مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود تھا، دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں مشہور فاضل اور نامور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب مقیم پیرس نے اس کی نقل حاصل کی تھی، اب اس کی بنیاد پر انھوں نے اس کو ایڈٹ کر کے شایع کیا ہے مگر پوری کوشش کے باوجود بعض عبارتوں خصوصاً اشعار کی مکمل صحت کا اہتمام نہیں ہو سکا۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اور حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور کے واقعات واقدی نے اپنے عام طریقہ کے مطابق قصہ گوئی کے انداز میں بیان کیے ہیں جس میں رطب و یابس سب کچھ جمع کر دیا ہے، اس نے اس میں سقیفہ بنی ساعدہ، حضرت ابو بکرؓ کی بیعت، اسامہ بن زید کے لشکر کی روانگی، فتنۂ ارتداد یعنی مانعین زکوٰۃ اور مدعیان نبوت کے خلاف حضرت ابو بکرؓ کی فوجی مہم اور عراق کی فتح کے لیے ان کے اقدام وغیرہ کی تفصیل درج کی ہے۔ شروع میں ڈاکٹر صاحب کے مقدمہ میں اس نازک موڑ پر حضرت ابو بکرؓ کی مناسب اور صحیح رہنمائی کی وضاحت کرنے کے بعد کتاب، مصنف اور مخطوطہ کے بارے میں ضروری معلومات درج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کتب تاریخ کی دو قسمیں بتائی ہیں، پہلی قسم کی کتابیں عوام کے لیے اور دوسری خواص کے لیے لکھی جاتی ہیں، عوام کو محض مربوط واقعہ سے دلچسپی ہوتی ہے، انہیں اس کی تفصیل

اور اس کے مآخذ سے کوئی بحث نہیں ہوتی، واقدی نے عام لوگوں ہی کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا اس لیے بعض لوگوں نے اس کے بارے میں حسن ظن سے کام لیا اور بعض لوگوں نے سوئے ظنی کی بنا پر اسے متہم کیا اور کذاب کہا، ہم ڈاکٹر صاحب سے ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ کیا دونوں طرح کی کتابوں کا پایہ یکساں ہو سکتا ہے اور یہاں تو معاملہ صرف تاریخ کا نہیں بلکہ سیرت نبویؐ کا بھی ہے۔ وہ واقدی کی توثیق و تکذیب پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ واقدی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲۰ ہزار غریب حدیثیں بیان کی ہیں جن سے کبار محدثین ناواقف تھے، یہ صحیح ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس نے ان کو گڑھ لیا تھا بلکہ اس نے ان کو عام لوگوں سے سنا تھا، وہ خود علماء و محدثین میں نہ تھا اس لیے ممکن ہے کہ اس کے راوی نے مبالغہ سے کام لیا ہو یا جھوٹ کہا ہو لیکن ہمارے خیال میں اس سے واقدی کا کذب ثابت نہیں ہوتا" ڈاکٹر صاحب کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش نظر رکھنا چاہیے تھا کہ کفیٰ بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع، انھوں نے واقدی کی توثیق کے لیے یاقوت حموی کا سہارا لیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے "دنیا جانتی ہے کہ یاقوت کا شمار ناقدین حدیث اور علمائے اصول میں نہیں ہے، وہ صرف ادب و جغرافیہ و تاریخ کا آدمی ہے، اس کو اشخاص کی جرح و تعدیل سے کیا تعلق ہے" ایک نادر و نایاب کتاب کو شایع کرنا ڈاکٹر صاحب کا بڑا کارنامہ ہے لیکن ایک داستان گو کی توثیق ان کے لیے مناسب نہیں جس کو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں اور مولانا شبلیؒ کے بقول "واقدی کی لغو بیانی مسلمہ عام ہے اور اس لیے ان کی شہرت بدنامی کی شہرت ہے (ایسے قصہ گو) عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے، خواص میں اس قدر مستند نہیں خیال کیے جاتے تھے" اور مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ "تاریخ و سیرت میں واقدی کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانحعمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں" کتاب کے آخر میں تین

فہرستیں ہیں ایک اشخاص و قبائل کی، دوسری جگہوں اور شہروں کی اور تیسری متن کے اشعار کی،

ہمارے دینی علوم :- از مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۲، قیمت ۱۸ روپیے۔ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم ملک کے مشہور مصنف اور صاحب نظر عالم تھے، یہ کتاب دینی علوم تفسیر، حدیث اور فقہ سے متعلق ان کے پانچ مضامین کا مجموعہ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۹۰ھ ہوا امرتسر سے شایع ہوا تھا اب دوسرا ایڈیشن مولانا کے فرزند ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری کی تگ و دو سے مکتبۂ جامعہ نے شایع کیا ہے، پہلے مضمون علم تفسیر میں اس کی تاریخ، عہد بہ عہد کے مفسرین کی تفسیروں اور قرآنی علوم کی تصنیفات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے نقائص کی نشاندہی کرکے قرآن فہمی کے مفید اصول و نکات بیان کیے ہیں، دوسرے مضمون "تفسیر بالروایت" میں نفس احادیث خصوصاً "تفسیری روایات کی بے اعتباری اور عدم اصلیت دکھائی گئی ہے جس سے ان کے خیال میں صحاح ستہ کے ابواب التفسیر کی روایتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں، اس کے ثبوت میں متعدد مثالیں پیش کرکے ثابت کیا ہے کہ یہ یا تو نص قرآن کے مخالف ہیں یا دوسری حدیثوں سے متعارض ہیں یا علم و عقل کے خلاف ہیں، تیسرے مضمون "علم حدیث" میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ حدیث یا خبر واحد کی حیثیت دینی نہیں بلکہ ظنی اور تاریخی ہے، البتہ آپ کا اسوہ حسنہ اور تواتر عمل یقینی اور دینی ہے اس مضمون میں احادیث کے وضع و کذب اور کبار صحابہ کی احتیاط و تقلیلِ روایت نیز ان کوششوں کا ناکافی ہونا دکھایا گیا ہے جو تنقید حدیث کے لیے کی گئی ہیں، ایک اور مضمون "حقیقت حدیث" کا خلاصہ یہ ہے کہ جن چیزوں پر ایمان لانے کا مطالبہ قرآن مجید نے کیا ہے ان میں حدیث شامل نہیں ہے اور یہ مختلف حیثیتوں سے غیر یقینی ہے آخری مضمون "علم فقہ" فقہ

ورائے کی اہمیت و ضرورت، علم فقہ کی مختصر تاریخ، چاروں فقہی مذاہب اور شیعی فقہ کے ذکر پر مشتمل ہے، اس میں فقہا کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے، احادیث کے بارے میں بے احتیاطی اور انتہا پسندی کی وجہ سے مولانا کی شخصیت متنازع فیہ رہی، اس کی پوری جھلک اس کتاب میں بھی ہے، اس سے قطع نظر قرآن مجید کے تعلق سے ان کے اکثر خیالات لائق توجہ اور قابل غور ہیں؛

مومنانہ زندگی کے اوصاف مرتبہ مولانا سلطان احمد اصلاحی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶۶، قیمت ۲۲ روپیے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

اس کتاب میں مومن کے خط و خال اور مومنانہ زندگی کے جن اوصاف و خصوصیات کی تشریح قرآن مجید و احادیث کی روشنی میں کی گئی ہے وہ یہ ہیں تعلق باللہ، محبت رسولؐ، فکر آخرت، تواضع وخاکساری، عفو و درگذر، نصح و خیر خواہی، مرحمت و مواسات، صلہ رحمی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، التزام جماعت، صبر و استقامت، ایثار و قربانی، ان سب امور کی وضاحت کرتے ہوئے انکی حقیقت، ان کے تقاضے، ان کے شرائط اور ان کے حصول کے وسائل و ذرائع کی تفصیل پیش کی گئی ہے، مثلاً "تعلق مع اللہ کی کیفیت پیدا ہونے کے لیے مصنف فکری مجاہدہ اور عملی مجاہدہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، عملی مجاہدہ میں عبادات وارکان کی ادائیگی کے سلسلہ میں وہ ان باتوں کی اہمیت واضح کرتے ہیں سنن و نوافل کا اہتمام، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی، تسبیح و تحمید، دعا، توبہ اور استغفار وغیرہ، اگر ان امور کی تفصیل میں امام غزالی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ وغیرہ علمائے سلام و متکلمین کی تشریح و تعبیر کو بھی مدنظر رکھا جاتا تو اس کتاب کی قدر و قیمت بڑھ جاتی، ایک جگہ "بادہ جاں فزا پیام" کی ترکیب دیکھکر حیرت ہوئی، کہیں کہیں اور بھی زبان و بیان کی فروگذاشتیں ہیں۔

اردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوششیں مرتبہ ڈاکٹر منظر اعظمی، متوسط تقطیع،

کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۲۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۶ روپیے، پتے: (۱) ڈاکٹر منظر اعظمی شعبہ اردو جموں یونیورسٹی جموں توی (۲) دانش بکڈپو ٹانڈہ، فیض آباد، (۳) انجمن ترقی اردو، اردو گھر راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

اردو شاعری میں عہد بہ عہد ارتقا کے ساتھ اس کی زبان میں تراش خراش اور اصلاح و ترمیم بھی ہوتی رہی ہے، اس کتاب میں اس کو منضبط کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی اہمیت اور اس میں توازن و معیار بندی کی ضرورت بتائی گئی ہے، اس مقصد سے مصنف نے اردو شاعری کا جائزہ تاریخی تسلسل سے لے کر اس کی زبان میں مرحلہ وار ترک و اختیار کی داستان سنائی ہے اور اس کے نتیجہ میں جو اختلاف، مباحثے اور معرکے رونما ہوئے ان کا ذکر بھی آگیا ہے، مصنف کے خیال میں شعری زبان کی اصلاح کا آغاز ولی کے عہد ہی میں ہوگیا تھا لیکن اس کا باقاعدہ سہرا شاہ ظہور الدین حاتم کے سر بندھتا ہے جس کا سلسلہ میر و مرزا کے بعد ناسخ اور انکے شاگردوں تک پہنچا اور پھر اس کی کڑی امیر، جلال، تسلیم، داغ اور ان کے شاگردوں سے مل گئی، ان سب کی اصلاحی جدوجہد پر گفتگو کرتے ہوئے ان لفظوں کی فہرست بھی دی ہے جن میں اصلاح ہوئی اور جن دوسرے لفظوں کا چلن ان کی جگہ ہوا، اس میں صرف اصلاحات کا جائزہ لینے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اچھے انداز میں ان پر بحث و تبصرہ بھی کیا ہے جس سے زبان و ادب کے بارے میں مفید باتوں اور دلچسپ نکتوں سے واقفیت ہوتی ہے۔

مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ مرتبہ مولانا سید جلال الدین عمری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰ مع ڈسک کور، قیمت ۲۰ روپیے، لائبریری ایڈیشن ۳۵ روپیے، پتہ: ادارہ تحقیق و تصنیف، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڈھ۔

مولانا سید جلال الدین انصر عمری ناظم ادارۂ تحقیق و تصنیف علی گڈھ، جماعت اسلامی ہند کے مشہور مصنف ہیں، سہ ماہی تحقیقات اسلامی اور ماہنامہ زندگی نو انہیں ان کی ادارت میں شایع ہوتا ہے، دینی مسائل پر عصری اسلوب میں ان کی متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن میں بحث و تحقیق کا ایسا پیرایہ اور معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بھی قابل قبول ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے مسلمان عورتوں کے وہ حقوق بیان کیے ہیں جو اسلامی شریعت نے انہیں عطا کیے ہیں اور ان اعتراضات کی تردید کی ہے جو عورتوں کے تعلق سے اسلام اور اسلامی فقہ و شریعت پر کیے جاتے ہیں، شروع میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ گذشتہ قوموں اور دنیا کے عام مذاہب میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی بے انصافی اور زیادتی کے رد عمل میں مغرب میں آزادی نسواں کی جو تحریک اٹھی اس سے معاشرہ اور انسانی زندگی میں کیا عدم توازن پیدا ہوا پھر عورتوں کو اسلام کے بخشے ہوئے حقوق کا ذکر ہے، اس کے بعد اسلام کے عورتوں کو جن حقوق سے محروم کر دینے کی بات کہی جاتی ہے ان پر بحث کی ہے، مثلاً عورت پر مرد کی حکمرانی، پردے کی بندش، معاشی تگ و دو کی ممانعت، تعدد ازدواج اور مطلقہ کو نفقہ نہ دینا وغیرہ کا موثر اور اطمینان بخش جواب دیا ہے، مہر، طلاق، خلع، عورتوں کی وراثت، قصاص، دیت اور شہادت کے مسائل پر مستند حوالوں سے مدلل گفتگو کی ہے، مصنف نے مطلقہ کے نفقہ کے ضمن میں "متاع" کی تحقیق کر کے معترضین کے اعتراضات کے تار و پود یکسر بکھیر دیے ہیں افتتاحیہ میں ان کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ حقوق کا لحاظ نہ کر کے اور اپنی بے عملی سے مسلمانوں نے یہ مسائل خود پیدا کر کے معترضین کو اسلامی قانون پر نکتہ چینی کا موقع دیا ہے۔ یہ کتاب بڑے سلجھے اور متین انداز میں لکھی گئی ہے اور اس لائق ہے کہ اس کا ترجمہ انگریزی اور

ہندی میں کیا جائے۔

تذکرہ شعرائے منیر شریف مرتبہ جناب سید شاہ مراد اللہ منیری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۱۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۰ روپیے، پتہ: (۱) خانقاہ منیر شریف، پٹنہ (۲) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔

بہار کے قدیم قصبہ منیر کو مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ احمد یحییٰ منیریؒ کی نسبت و تعلق سے بڑی مرکزیت اور غیر معمولی شہرت حاصل ہے، زیر نظر کتاب میں اس سرزمین سے تعلق رکھنے والے ۳۷ صوفی شعرا کا حال تحریر کیا گیا ہے اور ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے، اس کی ابتدا تبرکاً حضرت شاہ احمد یحییٰ منیری اور ان کے صاحبزادے حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے تذکرے سے کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ ان بزرگوں نے دین کی طرح شعر و ادب کی بھی خدمت انجام دی ہے۔

شمس العلماء قاضی عبید اللہ اورینٹل لائبریری مدراس کے اردو مخطوطات مرتبہ ڈاکٹر محمد غوث و ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال صاحبان، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۴۰، قیمت ۵ روپیے، پتے: (۱) مدرسہ محمدی، باغ دیوان صاحب ۳۲۳ ٹی ٹی کے روڈ، مدراس (۲) حبیب اینڈ کو ۴۰۶۵۰۵ اسٹیشن روڈ نامپلی، حیدرآباد (۳) انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایونیو، نئی دہلی وغیرہ۔

مدراس میں شمس العلماء قاضی عبید اللہ بن قاضی بدر الدولہ کا خانوادہ نسبی، علمی اور دینی حیثیت سے بہت ممتاز ہے، اٹھارہ پشتوں سے اسکو علمی و دینی وجاہت حاصل ہے، قاضی صاحب مرحوم نے مدرسہ محمدی کے نام سے جو مدرسہ قائم کیا تھا وہ اب بھی چل رہا ہے، ان کا کتبخانہ بھی اہم کتابوں اور نادر مخطوطات کا بیش قیمت ذخیرہ ہے، اب اس کے ۵۰ اردو مخطوطات کی یہ فہرست شایع کی گئی ہے جس میں کتابوں کا مختصر تعارف بھی درج ہے، اس سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑا فائدہ ہوگا۔ البتہ کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں مثلاً صدا پر نحس کو نجس لکھا ہے۔

"ض"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۵۸/-

۲۔ سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ ۵۸/-

۳۔ سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۲۸/-

۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۵۸/-

۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ ۲۳/-

۶۔ رحمت عالمؐ۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۷/-

۷۔ خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۶/-

۸۔ سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ ۲۵/-

۹۔ حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۵۸/-

۱۰۔ ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ ۲۴/-

۱۱۔ ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۸/-

۱۲۔ خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۴۵/-

۱۳۔ عربوں کی جہازرانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۵/-

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۴۹/-

۱۵۔ نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) ۴۲/-

۱۶۔ یادرفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۳۳/-

۱۷۔ مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۳/-

۱۸۔ مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۹/-

۱۹۔ مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۹/-

۲۰۔ برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ ۲۰/-

۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۴/- ۶/-

"منیجر"